جلد دوم

بابت اپریل ۱۹۲۲ء

حصۂ ششم

اُردو

انجمنِ ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

یوسف و زلیخائے فردوسی

از جناب حافظ محمود خاں صاحب شیرانی

دیباچہ نگار بایسنغر خانی اور اس کی تقلید میں دیگر تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ فردوسی نے اہالیِ بغداد کی خوشنودی کے لیے اپنے قیام بغداد کے دوران میں مثنوی یوسف و زلیخا تصنیف کی یہ کتاب (طبع دار الطباعہ خاصہ مدرسہ مبارکہ دار الفنون طہران ۱۲۹۹؁ھ) اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں کوئی ایسی تصریح یا تلمیح موجود نہیں جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ بغداد میں یا بغداد والوں کے لیے لکھی گئی تھی نہ اس کو کسی خلیفہ یا بادشاہ کی طرف منسوب ہونے کا دعویٰ ہے۔

مغربی مستشرقین میں ٹرنر میکین طابع شاہنامہ (کلکتہ) قابل ذکر ہے جس کا بیان ہے کہ فردوسی نے یہ کتاب والیِ عراق کے لئے تصنیف کی تھی۔ ڈاکٹر ایتھے جس نے یورپ میں اس مثنوی کا سب سے پہلا منتقدانہ ایڈیشن شایع کیا ہے۔ نیز پروفیسر براؤن کا عقیدہ ہے کہ یہ مثنوی فردوسی نے مجد الدولہ ابو طالب رستم کے لئے لکھی تھی۔

لیکن یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاتی کہ یوسف زلیخا جب کہ متاخرین میں مشہور رہی متقدمین میں اس کی شہرت جلوہ فرد زطاق نسیاں رہی ہے اور نویں صدی ہجری سے قبل کی ایک سند بھی ایسی نہیں ملتی جو اس کتاب کا ذکر یا اس کا علاقہ فردوسی سے تسلیم کرسکے اگرچہ فردوسی اور اس کے شاہنامہ کا ذکر متقدمین کے ہاں اکثر ملتا ہے اور یہ قضیہ ہمیں اس سوال پر آمادہ کرتا ہے کہ آیا موجودہ یوسف زلیخا فردوسی کی تصنیف کہلانے کی مستحق ہے یا نہیں کیونکہ ہمارے پاس بعض ایسے وجوہ ہیں جن کی بنا پر اس مسلّمہ عقیدہ کو شبہ کی نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض حلقوں میں یوسف زلیخا پر اعتراض ہوا ہے کہ اس کی زبان بہت کمزور ہے لیکن ساتھ ہی دفع اعتراض میں کہا گیا ہے کہ فردوسی بزم نگاری میں استاد نہیں بلکہ میدان جنگ اور رزمیہ کارنامے بیان کرنے میں اس کی طبیعت کا قدرتی رجحان تھا۔

کتاب یوسف زلیخا اگرچہ ایک ایسی مضمون پر لکھی گئی ہے جو اسلام میں مقبول رہا ہے اور کلام پاک میں حضرت یوسفؑ کے قصّہ کا ذکر آنے سے اس کے ہر دلعزیزی کو اور بھی فروغ مل گیا ہے۔ لیکن صاحب قرآن العجم کی یوسف زلیخا کی جو قدر فارسی خواں دنیا نے کی ہے چنداں محتاج بیان نہیں، لوگ مشکل سے اس سے واقف ہیں۔ برخلاف اس کے یوسف زلیخائے جامی اس قدر

مشہور ہے کہ بچہ سے لے کر بوڑھے تک سب اس کو جانتے ہیں حالانکہ تاریخی حیثیت سے دیکھتے ہوئے خواہ باعتبار قدامت خواہ بلحاظ روایت قصہ یوسف زلیخائے فردوسی نہایت مستند اور یوسف زلیخائے جامی اس کے مقابلے میں بالکل بودی و فرہی۔ سبحان العجم کی تصنیف کے نامقبول اور ناپسند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ وہ آگ جس کے لئے فردوسی مشہور ہے اس مثنوی میں بالکل خاموش ہے۔ نہ شاہنامہ کی متانت برجستگی اور جدت کا اس میں سُراغ چلتا ہے۔

شاہنامہ اور یوسف زلیخا کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم معلوم کرتے ہیں کہ دونوں کتابیں اگرچہ قریب العصر اور ایک شخص کی تصنیف ہونے کی مدعی ہیں لیکن طرزِ بیان اور زبان میں مختلف ہیں۔ شاہنامہ جن باتوں کو عموماً اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے مثلاً تعریفِ حسن، یوسف زلیخا ان کو شرح وبسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ شاہنامہ سے فردوسی کی خُو بُو مزاج پسند ناپسند اخلاقی نصب العین اور سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے لیکن زلیخا میں شاعر نے اپنی شخصیت کو اس حد تک چھپانے کی کوشش کی ہے کہ باوجود تمام کتاب پڑھ چکنے کے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا سکتا۔

یہ ایک مسلّمہ عقیدہ ہے کہ فردوسی نے عربی الفاظ سے احتراز کرکے شاہنامہ کو خالص دری زبان میں لکھا ہے لیکن اس کی کوئی اصلیت نہیں شاہنامہ میں سینکڑوں عربی الفاظ موجود ہیں فردوسی نے اِس باب میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے بلکہ جس تناسب سے عربی الفاظ رودکی دقیقی اور دیگر معاصرین میں پائے جاتے ہیں اور جو زبان وقت میں رائج تھے اسی تناسب سے فردوسی کے ہاں بھی ملتے ہیں اس لئے اس بارہ میں فردوسی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا ہے بلکہ قاعدہ اِس کے برعکس یوسف زلیخا میں عربی لغات کا استعمال ایک ضروری حد تک افراط کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اگر واقعی فردوسی اِس نظم کا مالک ہے تو دشوار معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس طرزِ رائج الوقت کو جو ساٹھ ستّر ہزار ابیات لکھنے کے بعد اس کی طبیعت میں بمنزلۂ طبیعتِ ثانیہ جاگزیں ہو چکی ہوگی نغمۂ خارج از آہنگ سمجھ کر جدید روش اختیار کرتا جو کسی صورت میں نقشِ اوّل سے مستوجب ترجیح نہیں بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو ناقص کمزور اور غیر مستقل ہے۔

فردوسی کے ہاں برخلاف دیگر اساتذہ کے اظہار مطالب میں تنوّع بوقلمونی اور رنگا رنگی نہایت محدود پیمانے پر ملتی ہے۔ جب کوئی خاص خیال اُس کو بار بار ادا کرنا ہوتا ہے تو دو چار مرتبہ مختلف پیرایوں میں اظہار کے بعد اس کی قوت معنی آفرینی ختم ہو جاتی ہے اور آیندہ اِس خیال کے ادا کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ وہی پرانا پیرایہ کسی قدر

تبدّل اور تغیر کے ساتھ یا بعینہ اسی شکل میں اختیار کرلے اس لیئے تکرار شاہ نامہ کی دل کش چہرہ کا نہایت بدنما خال ہے
یہ نقص زیادہ تر اس عصر کی زبان کی ناداری اور افلاس کی بنا پر ہے لیکن مثنوی یوسف زلیخا میں یہ خامی ایک بڑی
حد تک غیر حاضر ہے۔

یوسف زلیخا کے مقدمہ میں فردوسی گویا ہے کہ میں نے اکثر داستانیں اور پرانے قصّے نظم کیئے ہیں جن میں
رزم بزم، دوستی عداوت بلندی اور پستی سے بحث کی گئی ہے عشاق کے حالات لکھے (معشوقوں کا تذکرہ کیا) قصہ
مختصر ہر قسم کی نظم لکھی۔ اِن مشغلوں سے اگرچہ دل کو فرحت حاصل ہوئی لیکن دراصل میں نے تکلیف اور گناہ
کی کشت کاری کی جس سے پشیمان ہوں۔ دل اور زبان پر سکوت کی گرہ دیتا ہوں آیندہ جھوٹے افسانے لکھ کر
بیخ اور معصیت کی تخم ریزی نہیں کرونگا اس لیئے کہ میرے بال اب سفید ہو چکے۔ فریدوں سے سیر ہوں مجکو
کیا نفع اگر ضحاک تازی کا تخت اِس نے چھینا۔ کیقباد اور اس کی مملکت سے دل گیر ہوں اور تخت کیکاؤسی برباد
ہو چکا ہے۔ کیخسرو اور افراسیاب کی داستانیں لکھنے سے عذاب کے سوا اور کوئی پاداش نہیں مل سکتی۔ میری
اِس حماقت پر جس میں نصف عمر کھو کر رستم کا نام زندہ کیا اگر عقلا ہنسیں تو موزوں ہے۔ سہراب اور اسفندیار سے
دل خستہ ہوں کیوں کہ میری شمشاد نما قد پر اب سوسن زار کھل آیا ہے۔ زمانہ نے میرے چہرے سے مشک چرا کر
اِس کی بجاے کافورِ خشک چھڑک دیا ہے۔ باز سفید نے یکایک آکر میرے کوّوں کو جان سے مایوس کر دیا ہے
یہ باز میرے باغ میں اوّل اِدھر اُدھر اُڑتا پھرا پھر زاغ کی نشست گاہ کو اس نے اپنی مستقل قیام گاہ بنالیا وہ
کچھ ایسا جم کر بیٹھا ہے کہ کبھی نہیں اُڑیگا۔ میرا خیال تھا کہ باز زاغ کی خاطر آیا لیکن میں کیوں اپنے آپ کو شبہ میں
رکھوں اس کا صید زاغ نہیں ہے بلکہ میں خود ہوں۔ اب مجکو دنیا کے اشغال سے دل اُٹھا کر اپنی تدبیر کرنا چاہیئے
دیوانوں اور نادانوں کا رویّہ ترک کرکے عقلمندوں کا شعار اختیار کرتا ہوں اور بقیۃ العمر بجز نیکی اور راہِ راست
پر گام زن ہونے کے کسی اور راستہ پر قدم فرسائی نہیں کرونگا۔ داستانِ ملوک لکھنے سے توبہ کرتا ہوں اُن کے
دربار سے سیر ہو چکا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آیندہ لغو اور فضول داستانیں ہرگز نہیں لکھونگا کیونکہ وہ قطعی
غلط ہیں مستقبل میں انبیاء کرام کے قصص لکھونگا اس لیئے کہ ان کی اصل صدق پر مبنی ہے (ص ۱۴-۱۵)

اِس بیان سے ظاہر ہے کہ فردوسی تائب ہو کر زندگی کا ایک نیا ورق لوٹتا ہے وہ اپنے اِس حصّہ عمر سے جو

شاہ نامہ کی خدمت میں صرف کیا ہی پشیماں ہی۔ آستان ملوک اور دنیا کے اشغال سے بیزار ہو چکا ہی۔ چنانچہ اشعار

کنوں چارۂ بایدم ساختن　　دل از کارِ گیتی بپرداختن

گرفتن یکے راہ فرزانگاں　　نہ رفتن بہ آئینِ دیوانگاں

سر از راہِ داد و نہ برتافتم　　کہ کم شد زمن عمر و غم یافتم

کنوں گر مرا روز چندی بقاست　　دگر نسپرم جز ہمہ راہِ راست

نہ گویم دگر داستانِ ملوک　　دلم سیر شد ز آستانِ ملوک　　ص ۱۵

آخری شعر سے کم سے کم اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہی کہ یہ مثنوی کسی والی امیر یا بادشاہ کے واسطے نہیں لکھی ہی بلکہ مذہبی اثرات سے اثر پذیر ہو کر شاعر نے ایک دینی خدمت انجام دینے کی غرض سے لکھی ہی ؎

نہ گویم سخنہائے بیہودہ، ہیچ　　بہ بیہودہ گفتن نہ گیرم بسیچ

چہ باشد سخنہائے پرساختہ　　شب و روز اندیشہ پرداختہ

ز پیغمبراں گفت باید سخن　　کہ جز راستی شاں نہ نہ بیخ و بن　　ص ۱۵

لیکن اب وقت آگیا ہی کہ ان بیانات کی صحت کا امتحان کیا جائے۔ فردوسی بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہوگا جب اِس نے زلیخا میں لکھا ہی ؎

بریں می سزد گر بخندد خرد　　زمن خود کجا کے پسندد خرد

کہ یک نیمہ از عمر خود گم کنم　　جہانے پُر از نامِ رُستم کنم　　ص ۱۴

پُور زال سے فردوسی کی بغاوت کے قصہ پر ہمارے کان مشکل سے یقین کر سکتے ہیں اِسی رستم کے لیئے شاہ نامہ میں کہتا ہی ؎

جہاں آفریں تا جہاں آفرید　　سوارے چو رستم نیاید پدید

کسی دوسرے مقام پر گویا ہی ؎

کسے را کہ رستم بود پہلواں　　سزد گر بماند ہمیشہ جواں

شاہ نامہ کی نظم کے وقت فردوسی ان داستانوں نے کے لیئے گویا ہی کہ تم ان کو دروغ اور افسانہ مت

جانو اور واقعات کی رفتار کو اپنی زمانہ کی معیار کے مطابق قیاس نہ کرو جو باتیں قرین عقل ہوں اُن کو باور کرو باقی کی ترجمانی رمز اور ایما کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ شاہ نامہ ؎

تو این را دروغ و فسانہ مدان — بیکسان روش در زمانہ مدان

ازو ہرچہ اندر خورد با خرد — دگر بر رہ رمز و معنی برد

اساطیر عجمیہ کی نسبت شاعر کا یہ نقطۂ نظر معقولیت کا پہلو لیے ہوئے ہے لیکن زلیخا میں غیر ضروری سختی کے ساتھ قائل ہے ؎

کہ آن داستانہا دروغست پاک — دو صد شان نیرزد بیک مشت خاک

چہ باشد سخنہائے پرساختہ — شب و روز اندیشہ پرداختہ ص ۱۵

یہ عام تکذیب اور تردید پہلے نقطۂ نظر کے مقابلہ میں نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ معاندانہ ہے کیوں کہ شاہ نامہ کا وہ حصہ جو ساسانی پادشاہوں کی تاریخ سے تعلّق رکھتا ہے حقیقت میں صحیح تاریخ ہے اور نہ افسانہ اس کو "دروغ پاک" یا "سخنہائے پرساختہ" جو محض تخیل کی امداد سے بنا لیے گئے ہوں کہنا ایک صریح زبردستی اور ظلم ہے۔

فردوسی کو شاہ نامہ میں اپنی تصنیف پر ایک غیر معمولی فخر اور غرور تھا تمثیلاً سلطان محمود کو خطاب کر کے فخریہ لہجہ میں یہ غیر فانی ابیات لکھتا ہے ؎

یکے بندگی کردم اے شہریار — کہ ماند ز من در جہاں یادگار

بناہائے آباد گردد خراب — ز باران و از تابشِ آفتاب

بنا کردم از نظم کاخے بلند — کہ از باد و باران نیابد گزند (جلد دوم ص ۲۴۵)

کسی اور موقع پر یہی جوشِ مفاخرت یوں ادا ہوا ہے ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم گرم کردم بدیں پارسی (خاتمۂ شاہ نامہ قلمی ص ۵۲)

لیکن جب توبۂ نصوح سے ذوق یاب ہو چکا ہے تو خیالات میں ایک انقلابِ عظیم مشاہدہ کیا جاتا ہے چنانچہ زلیخا ابیات

ازاں تخم کشتن پشیماں شدم — زباں را و دل را گرہ برزدم

نگویم کنوں نامہائے دروغ — سخن را ز گفتار ندہم فروغ ص ۱۴

ہم اُن دعاوے پر صدق دل سے ایمان نہیں لا سکتے کیونکہ عمر بھر عجم اور صنادیدِ عجم کی پرستاری میں مصروف رہ کر آخری ایام میں فردوسی کے لیئے زندگی کا ایک نیا ورق انبیاء کرام کی خدمت گزاری کے لیئے لوٹنا تمام واقعات اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے اور بقولِ شاعر ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

لیکن ذیل کے اشعار ہیں جو زیادہ تر ہم کو محوِ حیرت و استعجاب کرتے ہیں۔

نگارم کنوں تخم رنج و گناہ　　که آمد سپیدی بجائے سیاہ　　(زلیخا ص ۱۴)

دیگر

زمن دستِ گیتی بدزدید مشک　　بجایش پراگندہ کافور خشک

برآمد زناگاہ باز سفید　　گسستند زاغانم از جاں اُمید

زمانے ہمی گشت زاغ از باغ　　سرانجام بنشست برجاے زاغ

نہ بنشستنے کش پریدن بود　　نہ پیوستنے کش بریدن بود　　(زلیخا ص ۱۴)

دیگر

پر از خاکِ شمشاد بود از نخست　　کنوں برکراں سوسن تازہ رست　　(زلیخا ص ۱۴)

ان اشعار کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ ہمارا شاعر بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کے بال سفید ہو گئے۔ شاعر کے طرزِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر میں یہ انقلاب یعنی پیری کی آمد اور بالوں کا سفید ہونا ایک تازہ واقعہ ہے جو مصرع "کنوں برکراں سوسنِ تازہ رست" سے صاف ظاہر ہے۔

ہم شاہنامہ میں بھی فردوسی کو بعض اوقات اپنی پیری کی شکایت میں مصروف دیکھتے ہیں مثلاً ذیل کے اشعار ؎

من از شصت و شش سست گشتم چو مست　　بجائے عنانم عصا شد بدست

رخ لالہ گوں گشت برسان کاہ　　چو کافور شد رنگ ریشِ سیاہ

زپیری خم آورد بالائے راست ہم از نرگساں روشنائی بکاست (جلد دوم ص ۲۴۴)

دیگر

دو گوش و دو پائے من آہو گرفت تہیدستی و سال نیرو گرفت (جلد سوم ص ۴۵)

دیگر

دو تائے شد آں سرو نازان بباغ ہماں تیرہ گشت آں فروزاں چراغ

پُر از برف شد کوہسار سیاہ ہمی لشکر از شاہ بیند گناہ (جلد سوم ص ۸۰)

دیگر

چو شصت و سہ آلم شد و گوش کر زگیتی چرا جویم آئین و فر (جلد سوم ص ۱۰۳)

دیگر

مرا دہر خوش آہستی گرفت ہماں سرو آزاد پستی گرفت

خروشاں شد ایں نرگسانِ دژم ہمی گرد داز سستی و رنج و نم

چل و ہشت بد عہدِ نوشیرواں تو بر شصت رفتی نمانی جواں

(خاتمہ جلد سوم صفحہ ۱۴۸۵ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

ان متفرق اشعار سے جو اوپر منقول ہیں اور شاعر نے اپنے ساٹھ اور چھیاسٹھ سال کی عمر کے درمیان میں لکھی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر شاہ نامہ کے دورانِ تصنیف میں ہی بالکل ضعیف اور بوڑھا ہو چکا تھا نہ صرف اس کے بال سفید ہو چکے ہیں جو منازل پیری میں اوّلین منزل ہے بلکہ بصارت بالکل ضعیف ہو چکی ہے۔ پیری سے قد خم ہو گیا اور کمر جھک گئی۔ دست و پا میں رعشہ نمودار ہے اور عصا کی مساعدت کے بغیر نقل و حرکت دشوار ہے۔ دانت گر چکے اور کانوں سے اپنے عمر کے تریسٹھویں سال ہی سے بہرا ہو گیا ہے۔ جب شاہ نامہ ختم ہو چکا ہے وہ قریبًا اسّی سال کا ہو چکا تھا مصرع (کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد) وہ خود معترف ہے۔

اگر مثنوی زلیخا فردوسی نے لکھی ہے تو ظاہر ہے کہ اس عمر کے بعد لکھی ہو گی اور شاہ نامہ کے بعد لکھی جانے کا خود اس تصنیف کو اعتراف ہے اگر یہ صورت ہے تو یوسف زلیخا میں اس اسّی بیاسی سال کے بوڑھے کو استیلائے

پیری سے جو شکایت ہی تو اسی قدر ہی کہ مصرع کہ آمد سپیدی بجاے سیاہ پیری کی اس قسم کی شکایت پچاس پچپن سالہ بوڑھے کی زبان پر بھلی معلوم ہوتی ہی نہ اسّی پچاسی برس کے پیر فرتوت کے منھ پر۔ تعجب ہی کہ یہ پیر ضعیف یوسف زلیخا میں پیری کی موجودگی سے اپنے میں یہی انقلاب دیکھتا ہی کہ اس کے بال سفید ہوگئے اِسی مطلب کو شاعرانہ پیرایہ میں ظاہر کیا تو کہا کہ مشک کافور بن گیا اور جدّت دکھانا چاہی تو کہا کہ سیاہ زاغ کی بجائے سفید باز نمودار ہوگیا اِس کے علاوہ وہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

اِس موقع پر اُصول تنقید ہم سے کہتے ہیں کہ یہ الفاظ فردوسی کے نہیں ہیں بلکہ کسی اجنبی کے جو مداح ہونے کی حیثیت سے فردوسی کو اسلامی دنیا میں مقبول بنانے کی غرض سے اس تصنیف کا ذمہ دار ہی لیکن چونکہ فردوسی کا ہم عہد اور ہمعصر نہیں ہی اور نہ زیادہ واقفیت رکھتا ہی اس لیئے شاعر کی عمر کے اندازہ کرنے میں غلطی کا مرتکب ہوگیا ہی۔

شہادتِ کلام یہ اوپر دکھایا جاچکا ہی کہ واقعاتی شہادت کی روسے کتاب یوسف زلیخا فردوسی کی تسلیم نہیں کی جاسکتی یہاں اسی مقصد کے لیئے کسی اور پہلو سے بحث کی جاتی ہی۔ اس سے ہمارا مقصد شہادت کلام ہی۔ شہادتِ کلام ہمارے پاس ایک ایسا زبردست آلہ ہی جس کی رہنمائی میں ہم ایک یقینی اور قطعی فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ امتداد زمانہ اور انقضائے ایام کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تغیّرات واقع ہوتے ہیں سیاسی انقلاب جس طرح قوموں کی مستقبل کی تاریخ بدل دیتے ہیں اِسی طرح زبان کا مستقبل بھی ان تغیرات سے محفوظ نہیں رہتا۔ ہر وقت اور ہر عصر کی زبان میں ایک نوعیت کی خصوصیت مشاہدہ کی جاتی ہی جو اُس کو دوسرے ازمنہ کی زبان سے ممیّز کرتی ہی۔ جوں جوں ایک قوم تمدّن اور معشرت کے مدارج میں ارتقا حاصل کرتی ہی اُس کو نئی ضروریات قدم قدم پر لاحق ہوتی ہیں، نئی ضروریات نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات ایجاد کرتی ہیں اور جس طرح ہم پرانا لباس بدن سے اُتار کر پھینک دیتے ہیں اسی طرح مندرس اور پارینہ الفاظ ایک فرسودہ سکہ کی طرح ٹکسال سے خارج کردیئے جاتے ہیں۔ زبان کی نبض شناسی کے لیئے لازمی ہی کہ ہم اُس کے تغیر و تبدل کی تاریخ اور الفاظ کے حقائق زیست و ممات سے بالکلیہ واقف ہوں۔

ایک اور اُصول ہے جس کا علم ہر محقق کے لیئے ضروری ہے انسان جس طرح شکل صُورت رنگ و لون اخلاق طبایع اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح اظہارِ خیالات اور ادائے مطالب میں ایک دوسرے سے منفرد ہیں تمثیلاً اگر ایک عہد کے دو انشا پرداز لیئے جائیں جو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ہم دیکھینگے کہ ان میں ادائے مضمون انتخاب الفاظ اور اسلوب کلام میں نمایاں تفاوت ہوگا باوجود اس اختلاف کے ان دونو معاصرین کی تحریرات میں ایک مماثلت قریبہ بھی مشاہدہ کی جائیگی جو باوجوہ معاصرت دونوں میں عام ہے کیوں کہ ہر چیز پر خواہ وہ مصنوعات دماغی سے تعلق رکھے یا مصنوعات دستی سے زمانہ اپنا داغ ضرور چھوڑتا ہے اور وہ خاتم جس کو ایام نے کسی چیز پر ثبت کیا ہے اس کے نقوشِ نگیں کو کوئی ہاتھ نہیں مٹا سکتا۔ اِس خصوصیت کو اسالیب ایّامی کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

علیٰ ھٰذا البعض خصوصیات اس قسم کی ہیں جو کسی خطّہٗ ملک میں رائج ہیں اگر مصنف اِسی حصّہٗ ملک کا باشندہ ہے تو یہ مقامی خصوصیت اِس کے کلام میں بھی پائی جاویگی مثلاً ہم شاہنامہ میں دیکھتے ہیں کہ فردوسی نابائی کو نانوا، ساربان کو ساروان اور برزیگر کو ورزیگر اور پیش باز کو پیش واز لکھتا ہے۔ اِس سے ہم یہ قیاس قرتب کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ فردوسی اور اس کے ہم وطنوں میں یہ الفاظ بائے ابجد کو واو ہوز سے بدل کر تلفظ کیئے جاتے تھے اس خصوصیت کا نام اسالیب مقامی رکھا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ ہر مصنف خواہ وہ کسی پایہ کا کیوں نہ ہو الفاظ کا ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے۔ اس ذخیرہ میں بعض الفاظ ترکیبات، محاورات، کنایات، تشبیہات، توصیفات اور استعارات اِس قسم کے ہونگے جو مُصنّف کے نزدیک زیادہ مقبول اور مطبوع ہونگے اس بنا پر ان کا استعمال بالارادہ یا بلا ارادہ تحریر میں زیادہ کریگا کیوں کہ وہ اِس کے روزمرّہ میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ سرمایہ اس کی تحریر کا اسلوبِ خصوصی ہے۔

جس طرح ایک مصوّر کسی شخص کی تصویر میں اس کی ظاہری شکل و صورت اور خط و خال رنگوں کے ذریعہ سے دکھا سکتا ہے اسی طرح ایک منتقد کسی مصنف کی ان تمام خصائص کی جو اُس کی تصنیف کے مخصوصی خط و خال ہیں سُراغ رسانی کر سکتا ہے اور اس سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ کسی شاعر کا قول ہے؎

ہر کجا اُفتادہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فرد دفترِ احوالِ صاحب خانۂ

جب صاحبِ بصیرت کے نزدیک ایک خشت دفترِ احوال کی ایک فرد ہی تو ایک کتاب جو مصنف کے دل و دماغ کا عکس خیالات، معلومات اور مقولات کا آئینہ ہی اور جس میں اس نے اپنی شخصیت کی تمثال کو الفاظ کے جامہ میں یادگار چھوڑا ہی نظر امعان میں اس صاحبِ تصنیف کی ہستی کو مشخص اور اس کے وجود کو دوسرے افراد سے جداگانہ شخصیت تسلیم کردانے کے لئے کیا کافی مواد اور ذخیرہ نہیں ہو سکتی جس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرہ حقیقت میں بجائے خود ایک تاریخ ہی؟

جب ایک ماہر آثار قدیمہ کسی شکستہ و ریختہ عمارت پر نظر ڈال کر اس کے عمومی وضع محرابوں کی ہیئت گنبدوں کی ساخت ستونوں کی نقاشی و نقاری چھت اور دیواروں کی گلکاری اور نقش و نگار سے اس کی تعمیر کا صحیح زمانہ قائم کر سکتا ہی تو کیا وجہ ہی کہ ایک محقق کسی کتاب کے مقالات کنایات اور محاورات کو دیکھ کر اس کے عہد تولید کا سُراغ نہ لگا سکے۔

قصہ مختصر شہادتِ کلام سے استفادن کی خاطر ہم کو اس نظر سے یوسف زلیخا کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کا مختصر ساخاکہ اوپر درج ہی۔ سب سے مقدم زلیخا کی مخصوصی خط و خال دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہی اور حتی الامکان شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہی۔

اِس مضمون کے دوران میں یوسف زلیخا اور شاہنامہ کے جن نسخوں سے میں نے کام لیا ہی وہ ذیل کے مطابع سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) یوسف زلیخائے حکیم فردوسی مصوّر۔ طبع ایران۔ دار الطباعہ خاصۂ مدرسۂ مبارکہ دار الفنون طہران سنہ ۱۲۹۹ھ

(۲) شاہنامۂ فردوسی۔ طبع میرزا محمد باقر۔ بمبئی سنہ ۱۲۷۵ ہجری

اسالیب خصوصی

گوش داشتن۔ بمعنی گوش کردن و متوجہ شدن کنایہ از نگہداشت و حفاظت۔ شاہنامہ میں پہلے معنوں میں عام طور پر رائج ہی۔

ذیل میں چند امثال مرقوم ہیں۔ شاہ نامہ :-

(۱) گشتاسپ گفت ای پسر گوش دار — که تندی نه خوب آید از شہریار (جلد دوم ص ۲۰۹)

(۲) که اے مادرِ مہرباں گوش دار — که ما بے گناہیم زیں کارزار (جلد چہارم ص ۳۳)

(۳) بدیں گفت من گوش دارید پاک — روا تر مخواہید جائے مغاک (جلد سوم ص ۶۰)

(۴) باندازِ من سر بسر گوش دار — پذیرندہ باش و بدل ہوش دار (جلد سوم ص ۵۸)

اِن امثال میں نگہداشت کے معنی دیتا ہے:-

(۵) سلاحِ سوارانِ جنگی بپوش — بجان و تنِ خویشتن دار گوش (جلد اول ص ۱۵۶)

(۶) بشد با بتہِ اشکشِ تیز ہوش — که دارد سپہ را بہر جائے گوش (جلد دوم ص ۲۱۷)

لیکن اس شعر میں منتظر رہنے کے معنوں میں آیا ہے:-

(۷) نباید که جوید کسے جنگ و جوش — برہام گودرز دارید گوش (جلد دوم ص ۲۵۰)

گزشتہ دو امثال کے سوا گوش داشتن شاہ نامہ میں حفاظت کے معنی نہیں دیتا۔ زلیخا میں وہ کنایہ بن کر عام طور پر حفاظت اور نگہداشت کے معنی دیتا ہے۔ زلیخا۔ امثال :-

(۱) نباید ورا چوں شما گوش دار — که خود گوش دارد ورا کردگار (ص ۱۷۰)

(۲) که او را بجاں گوش داریم پاک — بجان و دل و دیده داریم باک (ص ۴۸)

(۳) گر ایزد بدیں تو بہ یاری کند — ترا او مرا گوش داری کند (ص ۸۰)

(۴) من ایں پیرہن گوش دارم کنوں — نشویم زرے ہرگز ایں تیرہ خوں (ص ۶۶)

نظامی: بزرگاں دراں حال دارند گوش — وگرنہ نہ دل پاید ارو نہ گوش (سکندر نامہ بحری ص ۵۰ مطبع نولکشور)

سعدی: ہمہ سنگہا گوش دار اے پسر — که لعل از چیاتش نباشد بدر (ص ۱۹۰ بوستان مطبع فاعام)

مرزبان نامہ: "گفت اے ہدہد ایں جا که نشستہٴ گوش بخود دار و متیقظ باش که اینجا کمیں گاہ یغمائیان قضا ست" (ص ۱۱۱ مطبوعہ بریل ۱۹۰۹ء)

اس مطالعہ سے ہم کو اس قدر علم ہوا۔ که فردوسی جب که اس کنایہ کا عادی نہیں ہے صاحب زلیخا کے ہاں

وہ روزمرہ بن کر بالعموم مستعمل ہے۔ گوش داشتن کوئی ایسا کنایہ معلوم نہیں ہوتا جو اساتذہ کے ہاں مقبول ہو۔ سنائی کے ہاں جب کہ حدیقہ میں مطلق غیر حاضر ہے۔ نظامی اور سعدی کے ہاں صرف ایک ایک مثال میں ملتا ہے۔

گرہ برزدن یہ محاورہ شاہنامہ میں اس کے لغوی معنوں میں ملتا ہے۔ شعر

دو دست از پس پشت بستش چو سنگ — گرہ زد بگردنش بر پالہنگ (جلد سوم ص ۱۸)

اسدی — برآہیخت خرطوم پیل از زرہ — بہ پیچیدہ چون رشتہ برزد گرہ

(ص ۳۳ گرشاسپ نامہ طبع آقا محمد شیرازی ۱۳۱۳ھ)

یوسف زلیخا میں وہ کنایہ بن کر خاموش ہونے کے معنی دیتا ہے:۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) از آن تخم کشتن پشیمان شدم — زبان او دل را گرہ برزدم (ص ۱۴)

(۲) چو شمعون بپرداخت این داستان — زبان را گرہ زد ہم اندر زمان (ص ۱۶۵)

(۳) ولیکن تو گفتی بعمدا کسے — ہمی بر زبانم گرہ زد بسے (ص ۱۴۴)

گمان زدن۔ بمعنی گمان کردن یہ زلیخا کی شان خصوصیت ہے کہ اس میں گمان زدن ملتا ہے فردوسی شاہنامہ میں اس سے ناواقف ہے امثال از زلیخا ؎

(۱) تو گفتی ہمی زد دلش را گمان — کہ آید بلا ہا زمان تا زمان (ص ۴۸)

(۲) گمان زد دلم اے شہ کامیاب — کہ بنویسی آن نامہ ام را جواب (ص ۱۹۷)

(۳) گہش دل بدان سان ہمی زد گمان — کہ دے را بکشتند جائے نہان (ص ۶۸)

(۴) گمان زد دل پاک دے کین پسر — زبیگان شائستہ دارد گہر (ص ۹۵)

فردوسی ایسے موقعوں پر گمان کردن اور گمان بردن لاتا ہے جو زلیخا میں بھی آتی ہیں۔

دل برگماردن۔ شاہنامہ میں غیر مستعمل ہے اور زلیخا سے امثال ذیل ؎

(۱) ایا مادر مہربان زینہار — یکے گوش و دل را بمن برگمار (ص ۸۳)

(۲) کنون گوش را حال یعقوب دار — زمانے دل و ہوش دل برگمار (ص ۶۴)

(۳) بدو گفت کاے پر ہنر شہریار — دمے دل برین داستان برگمار (ص ۱۵۴)

(۴) ایا لے پدر دل بریں برگمار تامل کن اندر نہان و آشکار (ص ۱۹۱)

فردوسی ایسے موقعوں پر نگہ کن۔ بژرفی نگہ کن۔ گوش دار یا پہن بگشائے گوش لاتا ہے۔

آئین بستن - زلیخا میں رائج ہے۔ امثال ؎

(۱) بہ بستند آئین بازارہا ہمہ شہر شد ہیچو گلزارہا (ص ۲۱۰)

(۲) چو آئینہا بستہ شد در سرائے نکم بد سرا از بہشتِ خدائے (ص ۲۲۲)

شاہنامہ میں اس کے بجائے آذین بستن کا رواج زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ شاہنامہ ؎

(۱) چو نزدیک شہر اندر آمد سپاہ بہ بستند آذین ببیراہ و راہ (جلد دوم ص ۲۶۳)

(۲) بہ بستند آذین بشہر و براہ ہمہ برزن و کوے و بازارگاہ (جلد دوم ص ۲۶۶)

(۳) بہ بستند آذین بشہر اندروں پُر از خندہ لبہا و دل پُر ز خون (جلد سوم ص ۶۱)

(۴) بہ بستند آذین بشہر و براہ کہ شاہ آمد از دشت نخچیرگاہ (جلد چہارم ص ۱۰۴)

(۵) بہ بستند آذین بشہر و براہ درم ریختند از بر وخت شاہ (جلد چہارم ص ۲۳)

گرمی نمودن - گرم جوشی کا اظہار کرنا شاہنامہ سے یہ محاورہ مفقود ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) بشد مرد بسیار گرمی نمود بجا آورید آنچہ فرمودہ بود (ص ۱۶۱)

(۲) ہزاراں لُطف کرد و گرمی نمود ابر مہر دوشین فراواں فزود (ص ۲۶)

(۳) فراواں بہ پرسید و گرمی نمود دلش را ابد و مہربانی فزود (ص ۲۱۸)

صُورت بستن شاہنامہ میں نہیں ملتا زلیخا سے یہ امثال ؎

(۱) خریدش البت صُورت عزیز بچنداں کہ بودش ز ہر نوع چیز (ص ۹۴)

(۲) مکن اے پدر صُورت بد بلند زما بر برادر نباید گزند (ص ۱۷۱)

(۳) کہ صورت ہمی بندم اندر میاں کہ ہست آن دلارام من در جہاں (ص ۱۹۰)

قابوس نامہ " ولیکن من چنداں کہ صورت بند د بگویم و سامان ہر یک بتو نمایم "
(باب سی و یکم در طالب علمی و فقیہی ص ۱۴۲ طبع ایران)

مرزبان نامہ " و بوقت گزشتن ازیں منزل انقطاع وجدائی او صورت نہ بندد"
(باب سویم داستان ملک اردشیر و دانائے مہران بہ ص۲۰)

تخت زدن زلیخا میں عموماً مستعمل ہے اور تمام شاہنامہ میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے امثال از زلیخا ؎

(۱) میاں جائے میدان زدہ تخت زر عزیز از سرِ تخت با تاج زر (ص ۹۲)
(۲) زدند ے یکے تخت زریں اراں نشستی برآں یوسفِ کامراں (ص ۱۶۰)
(۳) یکے تختِ زرّیں میانش زدہ سرِ پائے آں تخت برمہ زدہ (ص ۱۶۸)
(۴) زدن تخت زرّیں گوہر فگند قدمہاش چوں قدر شاہاں بلند (ص ۱۷۴)

شاہنامہ میانِ سراپردہ تختے زدہ ستادہ غلاماں بہ پیشیں زدہ (جلد اوّل ص ۹۴)

اسدی یکے تخت پیروزہ ہم رنگ نیل زدہ پیش تخت ایستادہ دو پیل
دگرشاسپ نامہ ص ۳ طبع آقا محمد شیرازی ۱۳۰۶ھ)

کلّہ زدن با ثانی مشدّد سقف و پردہ زدن شاہنامہ میں نہیں ملتا اور زلیخا میں ملتا ہے امثال از زلیخا

(۱) زدہ کلّہ و تاجِ گوہر نگار برآئیں درآویختہ شاہوار (ص ۱۶۶)
(۲) زدہ کلّہ بالائے شاہانہ تخت نشستہ بر و یوسفِ نیک بخت (ص ۲۲۲)

اگرچہ شاہنامہ اس محاورہ سے نابلد ہے اسدی کے ہاں ملتا ہے چنانچہ ؎

(۱) رسیدند زے آبگیرے فراز زدہ کلّہ زربفت از وے فراز دگرشاسپ نامہ ص ۱۴)
(۲) زدہ کلّہ برگشتہ کرگس ز ابر طمع کردہ روبہ بخونِ ہزبر (ص ۶۴)

مسعود سعد سلمان بدّرو گوہر آراستہ پدید آمد ع چو نو عروسے در کلّہ ازمیاں حجاب حکیم سنائی غزنوی ؎

دستِ انصاف تا تو بکشادی ایں جہاں بست کلّۂ شادی (حدیقہ ص ۱۹۷ مطبع نولکشور)

عتاب داشتن شاہنامہ سے غیر حاضر ہے اور زلیخا سے یہ امثال ؎

(۱) چنیں گفت یوسف علیہ السلام کہ برداشتیم آں عتاب و کلام (ص ۲۰۲)

(۲) شنیدم کہ یوسف سبک خواست آب | چو برداشت آں عتاب از میاں (ص ۲۰۳)

غریویدن لغات میں شور و غوغا نیز فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے زلیخا میں مطلق رونے کے معنوں میں مستعمل ہے امثال از زلیخا ؎

(۱) بمہرِ دلش تنگ در بر گرفت | وزاں پس غریویدن اندر گرفت (ص ۵۰)

(۲) زمانے غریوید و بارید خوں | برآں چہرِ چوں چین دینار گوں (ص ۲۱۸)

(۳) پس آمد غریوان بہ نبگاہ باز | دلش بے شکیب و تنش در گداز (ص ۵۲)

(۴) غریویدنِ آں فرزاں چراغ | ہمی کرد یعقوب را دل بداغ (ص ۳۷)

(۵) فراواں غریوید و نالید زار | ازاں خواب و اثر و نہ نابکار (ص ۴۳)

(۶) غریویدن و زاری اندر گرفت | زہر گونہ نوحہا بر گرفت (ص ۵۸)

(۷) غریوید یوسف دگر بارہ زار | بغلطید بر خاکِ رہ زار و خوار (ص ۵۹)

یاد رہے کہ صاحب یوسف زلیخا اِس لفظ کا بہت مشاق معلوم ہوتا ہے اور اسی لیئے اس کا استعمال کثرت کے ساتھ کرتا ہے۔ شاہنامہ میں وہ اوّل تو قلت کے ساتھ ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو محض شور للکار یا فریاد کے معنی دیتا ہے۔ امثال شاہنامہ ؎

(۱) غریویدنِ مرد و غرّندہ کوس | ہمی کرد بر رعد غرّاں فسوس (ص ۶۰) جلد اوّل

(۲) غریویدن آمد ز توراں سپاہ | زسر بر گرفتند گرداں کلاہ (ص ۲۲۷) جلد دوم

(۳) وزاں پس زہم روئے برگاشتند | غریویدن و بانگ برداشتند (ص ۲۳۶) "

(۴) سبک شتباں گوشہا بر گرفت | غریواں ازو ماند اندر شگفت (ص ۶۸) جلد اوّل

افعالِ متعدی بیک مفعول

زلیخا کی ایک خصوصی شان یہ ہے کہ اِس میں بعض افعال جو عموماً متعدی بیک مفعول لائے جاتے ہیں متعدی بدو مفعول باندھے گئے ہیں بعض تمثیلیں یہاں درج ہیں۔

پوشیدن بمعنی جامہ پوشانیدن زلیخا سے امثال ؎

(۱) به پوشید آں جامہ فرزند را — بشانہ زد آں موئے دل بند را (ص ۵۱)

(۲) درو جامہ پوشید دیبائے روم — کہ چوں نقشِ مانی بدش نقشِ بوم (ص ۸۵)

لیکن شاہنامہ میں تن ڈھانکنے کے معنوں میں ایک مقام پر ملتا ہے ؎

تنش را یکے پہلوانے قبائے — بہ پوشید و از کوہ بگزارد پائے (ص ۲۹) جلد اول

پرہیزیدن بجائے پرہیزانیدن زلیخا امثال ؎

(۱) کہ ایں بندہ را اندریں قعرِ چاہ — بہ پرہیزو از آب دارش نگاہ (ص ۶۲)

(۲) مکن یادہ نام و نشانِ مرا — بہ پرہیز جان و روانِ مرا (ص ۱۱۵)

(۳) بہ پرہیز زاہرمن بیش بیم — ہمی دار دست از بدی کو تہم (ص ۲۲۴)

شاہنامہ میں یہ صورت نامعلوم ہے۔

شنیدن بجائے شنوانیدن زلیخا ؎

(۱) بہ شک بود یعقوب فرخ سیر — سرانجام پرسید زاں پرہنر
کہ یوسف چو بشنید پیغامِ خویش — نشانیت بنمود زاندام خویش (ص ۱۰۶)

شاہنامہ میں یہ صورت نہیں ملتی۔

اسالیب مقامی

خرید و فروش بجائے خرید و فروخت۔ زلیخا شعر

بدینساں خرید و فروش اوفتاد — ستد یوسف آں در بہا بداد (ص ۶)

فردوسی خرید و فروخت لاتا ہے شاہنامہ ؎

(۱) ہمی بود چندے خرید و فروخت — بیاباں ز لشکر ہمی بر فروخت (ص ۲۲) جلد سوم

(۲) پُر از خورد و داد و خرید و فروخت — تو گفتے زماں چشم ایشاں بدوخت (ص ۶۲) جلد دوم

قابوس نامہ "بندہ کہ بہر کارے فروخت خواہد و از خرید و فروخت خویش عیب ندارد دل بروے منہ کہ از وے فلاح نیاید۔"

(باب بست و سیم در بندہ خریدن ص ۱۰۹)

سعدی　　بریدند ازاں جا خرید و فروخت　　زراعت نیاید رعیت بسوخت (بوستان ص ۲، مطبع رفاہِ عام)

پرس بجائے پرسش زلیخا ؎

چو یعقوب فرخ بہ پرس و درود　　ابا ابن یامین سخن گفتہ بود (ص ۲۰۹)

طلحہ مروزی　　چوں صبر رمیدہ شد پیام تو چہ سود　　جاں رفت ز پرسش و سلام تو چہ سود

شاہنامہ میں پرسش اگرچہ رائج ہے لیکن موجودہ صورت قطعی غیر حاضر ہے۔

بند و کشائے بجائے بند و کشاد یا بست و کشاد۔ شاہنامہ میں ان تینوں صورتوں میں سے ایک بھی نہیں ملی۔ پہلی صورت زلیخا میں ملتی ہے امثال ؎

(۱)　　زسختی و سستی و بند و کشائے　　کہ دیدند پیغمبرانِ خدائے (ص ۱۵)

(۲)　　تن و جاں سپردم بحکم خدائے　　بسختی و بہ سست و بہ بند و کشائے (ص ۰)

(۳)　　چنیں تا بہ تقدیر بحکمِ خدائے　　کہ بے حکم او نیست بند و کشائے (ص ۲۲۲)

بند و کشاد کی مثال میں انوری کا شعر دیا جاتا ہے۔

زمانہ ملکے کز مہر خاتمش در ملک　　ہزار بند و کشاد و ہزار برگ و نواست

مثال بست و کشاد۔ مرزبان نامہ "کاہلی و خامی را خورسندی مخواں کہ نقش عالم حدوث در کارگاہ جبر و قدر چنیں بستہ اند کہ تا تو در بست و کشاد کار ہا میانِ جہد نہ بندی ترا ہیچ کار نکشاید"

دادخواہ بمعنی دادپسندِ خدائے تعالیٰ۔ اِن معنوں میں شاہنامہ میں نہیں ملتا زلیخا سے امثالِ ذیل ؎

(۱)　　من اوّل خطا کردم اے دادخواہ　　مقرم بداں کار زشت و گناہ (ص ۲۱۶)

(۲)　　بداں پایگاہ و بدیں دستگاہ　　سپردی بمن بازش اے دادخواہ (")

(۳)　　ہمی ترسم از داوردادخواہ　　کہ ہرگز نیامرزدم زیں گناہ (ص ۱۳۶)

شاہنامہ میں فریادی کے معنی دیتا ہے۔ امثال ؎

(۱)　　ہمی راہ جویند نزدیک شاہ　　زراہِ دراز آمدہ دادخواہ (ص ۲۰۵، جلد دوم)

(۲) ز خویشان کاموس چندیں سپاہ به نزدیک خاقاں شدہ داد خواہ ص ۱۸۹

خوار بار لغات میں (برہان قاطع) اس کے معنی خوراک اندک دیئے ہیں شاہنامہ میں اس لفظ کی تلاش بے سود ثابت ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ فردوسی اس سے ناواقف تھا۔ عطا بن یعقوب الکاتب جو قرن پنجم کے منصف دوم کا شاعر اور سلطان ابراہیم غزنوی کا مادح ہے لکھتا ہے کہ:-

آں کہ نامش خوار بار وزیر بارش خلق خوار خورد چوں ندان ہا روکردہ شہری چوں سلیم

(لباب الالباب محمد عوفی - باب ششم ص ۵۷ - طبع بریل)

برہان الاسلام تاج الدین عمر بن مسعود مقتول ۶۰۵ ہجری شعر

من خود عزیز بارنیم خوار بار گیر آخر نہ گاہ بہ بود از خوار بار دور

(لباب، باب ہفتم ص ۱۷۵ حصہ اول)

زلیخا میں یہ لفظ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) دہم خوار بار و کنم نیکوئی نہ گردم بہ گردِ درِ بدخوئی (ص ۱۹۹)

(۲) دہم تاں ازیں بیشتر خوار بار گلِ سرخ تاں بشگفانم ز نار (ص ۱۶۶)

(۳) ز کنعاں کشیدیم رختے جہاز کزیں خوار بار است مارا نیاز (ص ۱۶۱)

(۴) یکے دانہ تاں ندہم از خوار بار کنم تاں بروں از در مصر خوار (ص ۱۶۹)

(۵) خبر یافتیم از تو اے شہر یار کہ داری بمصر اندروں خوار بار (ص ۱۶۴)

اسالیبِ ایامی

ملکت بمعنی مملکت فی زمانہ متروک ہے شاہنامہ میں غیر رائج ہے اس لیئے قیاس یہی چاہتا ہے کہ سلجوقی دور میں اس کا رواج پھیلا۔ اِس عہد کے شعرا منوچہری معزی عثمانی مختاری حکیم سنائی اور عمعق بخاری وغیرہ وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔ بعض امثال حوالۂ قلم ہیں ؎

منوچہری۔ آفتابِ ملکتِ سلطاں کہ دستِ جودِ او خواہد اورا کز میانِ خلق بے ہمتا کند

امیر معزی موید ے کہ موید بد دست ملکت شاہ

حکیم سنائی شاہ عادل نکو نیت و دستور ملکت آباد دست ظالم دور (حدیقہ ص ۶۶۷ طبع نولکشور)

حدیقہ میں یہ شعر کثرت سے ملتا ہے۔ استاد عمعق بخاری ؎

"کنوں شد این مثل اے پادشاہ معلوم   باہتتے کہ ہلاک ست و ملکتے کہ ہباست"

(لباب۔ حصّۂ دوم۔ باب دہم ص ۱۸۵)

مثنوی یوسف زلیخا سے یہ مثال پیش ہے ؎

گرفتم دل از ملکت کیقباد   ہماں تخت کاؤس کے بر د باد   (مقدمۂ زلیخا ص ۱۴)

غریو و غرنگ یا بالعکس بمعنی گریہ و زاری۔ شاہنامہ میں اس کا سراغ نہیں چلتا ؎

اسدی   بگفت این و شد با غریو و غرنگ   بہ لالہ ز لولو ہمی شست رنگ

(ملحقات شاہنامہ ص ۸ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

ازرقی   موافق تو کند ز صعود و ناز و طرب   مخالف تو کند ز غماں غریو و غرنگ

(لباب الالباب۔ حصّۂ دوم باب دہم ص ۹۹)

زلیخا میں کئی مقام پر ملتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) نہ شد کور آدم بچنداں و رنگ   کہ بد سال و مہ با غریو و غرنگ   (ص ۴۲)

(۲) شتاباں شتر در بیاباں چو دیو   دل یوسف اندر غرنگ و غریو   (ص ۸۱)

(۳) ورا دید جفت غریو و غرنگ   نہ در دل شکیب و نہ در چہرہ رنگ   (ص ۱۲۰)

(۴) کہ این نالہ و زاری از بہر چیست   غریو و غرنگ تو از بہر کیست   (")

(۵) ہمہ روز بد با غریو و غرنگ   دلش تنگ و عالم بد و گشتہ تنگ   (ص ۱۱۶)

از بہر چیزے یا کسے را یہ ایک اور صورت ہے جس سے ہم شاہنامہ میں روشناس نہیں ہوئے اور زلیخا میں دو چار ہوتے ہیں۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) تو بپذیر از و یوسف خوب را   ہمی دارش از بہر یعقوب را   (ص ۳۷)

(۲) من اے روشنائی ز بہر چرا   بباید ہمی آزمودن ترا   (ص ۱۱۴)

قابوس نامہ "دو دانگ ذخیرہ کن از بہر روز ضرورت را دلپشت بروی کن بہر خللے از رُوے یاد میا"

(باب بست ویکم در جمع کردن مال ص ۹۶)

حکیم سنائی یارب ایں حسن لطانِ عالم را گم کن از بہر غرا آدم را (حدیقہ ص ۱۴۹)

سنائی کے ہاں یہ محاورہ بہت مقبول ہے۔

عبدالواسع جبلی ہر روز بامداد ز بہر مرا نہی از مشک سودہ بر سمن تازہ خالہا

(لباب - باب دہم ص ۱۰۸ حصہ دوم)

لطف بہ تحریک اوّل و ثانی بقاعدۂ تفرس درست ہے چنانچہ منوچہری ع

از لطف ہر چہ کند با تو سزاے تو کند

اور ادیب صابر قطب فضل و فلک دولت و مجموع علوم قبلۂ ہمت و حلم و لطف و جود و کرم

مثال از زلیخا فراواں لطف کرد و گرمی نمود ابر مہر دو شیس فراواں فزود (ص ۲۶)

عفو بروے تفرس بفتح اوّل وضم ثانی - یوسف زلیخا دونوں تلفظ سے واقف ہے۔ امثال از زلیخا۔

(۱) دگر راست گوئید با من سخن عفو تاں کنم کردہاے کہن (ص ۱۴۷)

(۲) صلاح جہاں را ازو خواستی تن خویشتن را عفو خواستی (ص ۱۵۲)

(۳) عفو کردمت زاں گناہِ عظیم بحاجت بخواہم ز ربّ عظیم (ص ۲۰۷)

(۴) ایا داد فرہنگ با بیخ و بُن عفو کن مرا زیں برہنہ سخن (ص ۱۱۶)

سعدی عفو کردم از رُوے عملہای زشت در آرم بفضلِ خودش در بہشت

فردوسی اوّل تو شاہ نامہ میں اس لفظ کا استعمال ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو قاعدۂ تفرس سے نابلد ہے اور صحیح تلفظ سے لکھتا ہے۔

شاہنامہ بکن عفو یارب گناہِ درا بیفزاے در حشر جاہِ درا (دیباچہ ص ۳)

عمدا بسکونِ دوم - استاد عمعق بخاری ع

اے صنوبر قد نہ دانی تو چگونہ فتنۂ یا ہمی دانی بعمدا خویشتن ناداں کنی (لباب حصہ دوم، باب دہم ص ۱۹۰)

حکیم ضیاالدین محمود الکابلی - شعر

بگاہِ حلم عمداً از نہیبِ ضربتِ عدلت　　بریزد زہر از مار و بیفتد نیش از کژدم

(لباب - حصّۂ دوم باب یازدہم ص ۲۱۶)

زلیخا میں ایک مقبولہ روزمرّہ بن گیا ہے - زلیخا ؎

(۱) بعمدا ہمی تاختندش براہ　　باندک زماں پائے وے شد تباہ　(ص ۵۳)

(۲) بعمدا سوئے سقف گردش نگاہ　　ہماں سیم تن دید چوں مہر و ماہ　(ص ۱۲۷)

(۳) ولیکن تو گفتی بعمدا کسے　　ہمی برزبانم گرہ زد بسے　(ص ۱۴۴)

شاہنامہ نہ صحیح اور نہ مفرس لاتا -

عماری زلیخا اگرچہ صحیح تلفّظ سے باخبر ہے - حرفِ دوم کو مشدد بھی باندھا ہے - امثال از زلیخا ؎

(۱) یکے کارواں ساخت چوں نو بہار　　ز بس مہد و عمّاریِ زرنگار　(ص ۲۰۸)

(۲) زناں شاں بعمّارے اندر ہمہ　　عماری بزرّ و بزیور ہمہ　(ص ۲۰۹)

(۳) کہ از مہد و عمّاریِ زرنگار　　شود خیرہ چشم و دل روزگار　(ص ۲۰۷)

شاہنامہ میں عماری کا ذکر اگرچہ پچاسوں مقام پر آیا ہے - لیکن مشدد کی ایک مثال بھی دستیاب نہیں ہوئی -

شاہنامہ (۱) عماری بسیچید و دیبا جلیل　　کنیزک ببردند چینی و خیل　(ص ۲۶ جلد سوم)

(۲) عماری چہل جملہ از سیم و زر　　بدو اندروں لعبتِ سیمبر　(ص ۲۰۶ جلد دوم)

(۳) عماری بسیچید و رفتن براہ　　مر آں خفتہ را اندروں جایگاہ　(ص ۲۰۷ جلد دوم)

(۴) عماری بماہ نو آراستہ　　پسِ پشت او اندروں خواستہ　(جلد اول ص ۶۰)

(۵) عماری بسیچید و آمد براہ　　نشستہ بدو اندراں جفت شاہ　(ص ۱۴۳ جلد سوم)

زلیخا کے دوران میں عماری کا نیا تلفظ فردوسی کے لئے سیکھنا قابلِ استعجاب ہے -

مشاطہ بلا تشدد دوم شاہنامہ میں فردوسی اس لفظ سے واقف نہیں - امثال از زلیخا ؎

(۱) زیعقوب زہر کس اندر نہفت　　مشاطہ بلیبا فرستاد و گفت　(ص ۲۵)

(۲) مشاطہ شد آراست آں ماہ را — وآں مہرباں دخت دل خواہ را (ص ۲۵)

اسدی — ہمیدوں نموز و دیش چاکرست — بہارش مشاطہ خزاں زرگرست (ص ۶) گرشاسپ نامہ

مسعود سعد سلمان — مگر مشاطۂ بستاں شدہ ست باد و سحاب — کہ این بہ بستش پیرایہ واں کشاد نقاب

حکیم سنائی — خرد آمد مشاطۂ جانت — خرد آمد چراغ ایمانت (حدیقہ ص ۳۴۶)

میشوم — بمعنی شوم، مشئوم کی بگڑی شکل ہے، شاہنامہ میں نامعلوم ہے اور زلیخا سے امثال ذیل

(۱) ازاں روز میشوم کاں بدخبر — شنیدم بگوش دل و ہوش سر (ص ۱۷۳)

(۲) ازاں روز میشوم و تاریک ذو — کہ مہجور شد یوسف با خرد (")

قابوس نامہ "وباشد کہ نہ چنیں بود ولیکن میشوم بود و صاحب کش بود"

(باب بست و پنجم در چہار پائے خریدن ص ۱۱۳ طبع ایران)

سنائی غزنوی — کاں کہ گوید منم شدہ معصوم — اوست بر نفس خویشتن میشوم (حدیقہ ص ۲۴۴ نولکشور)

نکوئی — بمعنی حسن و جمال، ان معنوں میں شاہنامہ میں یہ لفظ غیر مستعمل ہے اور زلیخا میں بالعموم ملتا ہے

مثال۔ زلیخا

(۱) ترا ہست چنداں جمال و کمال — نکوئی و کشی و غنج و دلال (ص ۱۱۶)

(۲) نکوئی سپاہست شاہش توئی — زمیں آسمان ست و ماہش توئی (ص ۱۱۷)

(۳) دو صد بار زاں خوب تر گشتہ بود — نکوئیش زاندازہ بگزشتہ بود (ص ۹۷)

سنائی غزنوی — رفت وقتے زنے نکو در راہ — شدہ از کارہائے مرد آگاہ (حدیقہ ص ۳۷۹)

کارگیراں — زلیخا میں ملازمین اور چاکروں کے معنوں میں آتا ہے زلیخا

(۱) ازاں شادمانی ہم اندر زماں — بفرمود پنہاں بکارگیراں — ص ۱۶۷

(۲) چو اسباط بیروں شدند از سرائے — بفرمود فرخ شہ نیک رائے

(۳) بکارگیراں تا بہ بندند بار — تمامی صد اشتر ہمہ خوار بار

(۴) بکردند آں چاکراں کار خویش — بفرمان شاہ جہاں از خویش — ص ۱۸۱

شاہنامہ میں یہ لفظ معمار اور دیوار گر کے معنی دیتا ہے امثال از شاہنامہ ؎

(۱) دگر گفت کاریگراں آورید ـ وگچ و سنگ و خشتِ گراں آورید

(۲) چہل روز تا کار نشیندم ـ زکاریگراں شاہ نگزیندم

(۳) بدانست کاریگر راست گوے ـ کہ عیب آورد مرد دانا بدوے

(۴) برفتند کاریگراں سہ ہزار ـ زہر کشورے ہر کہ بد نام دار

(ساختن خسرو شہر مداین را ص۲۱۰۱ جلد چہارم شاہنامہ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

زلیخا میں اگر اس لفظ کو نئے معنوں میں استعمال کرنا فردوسی سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

جلدی بمعنی چالاکی و زودی شاہنامہ میں غیر رائج ہے۔ زلیخا سے یہ مثالیں پیش ہیں ؎

(۱) بجلدی زنِ چابکِ پیش دست ـ کیانی کمر بر میانش بہ بست (ص۳۹)

(۲) بدانست کاں بد زحکمِ خدائے ـ نہ از روئے جلدی بد و جہد رائے (ص۲۰)

(۳) زجلدی دگر بارہ فریاد زد ـ چنیں گفت کاے ناخردمند مرد (ص۱۲۹)

حکیم سنائی غزنوی سگ اگر جلد بودی و فربہ ـ یک شکارے نماندے اندر دہ (حدیقہ ص۴۴۶)

قضارا شاہنامہ میں اس کا رواج نہیں معلوم دیتا اگرچہ ذیل کی مثال میرے قول کے مخالف ہے

شاہنامہ ـ کہ ایرج بر و مہر بسیار داشت ـ قضارا کنیزک ازو بار داشت ـ جلد اول ص۳۰

تمام شاہنامہ میں اس قسم کی ایک نظیر ملنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فردوسی اس محاورہ کا عادی تھا ممکن ہے کہ بعد کی ترمیم ہو۔ زلیخا میں البتہ یہ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ زلیخا ؎

(۱) قضارا شبے دید روشن بخواب ـ کہ دہ گرگ با خشم و کین و عتاب (ص۴۳)

(۲) قضارا یکے روز یوسف پگاہ ـ بروں شد بامید یک لخت راہ (ص۱۰۳)

(۳) قضارا یکے دایۂ سال خورد ـ بناگہ بداں سیم تن باز خورد (ص۱۲۰)

(۴) ہمیں بود غمگیں دلِ شہریار ـ قضارا فراز آمد آں آبدار (ص۱۴۳)

اسدی طوسی ـ قضا ہر دو برہم رسیدند تنگ ـ ردہ برکشیدند و برخاست جنگ (ملحقات شاہنامہ ص۹)

سنائی غزنوی — از قضا را و بای گاو اخاست — ہر کہ را پنج بود چار بکاست

سعدی — قضا را من و پیری از فاریاب — رسیدیم در خاکِ مغرب بآب

ورج بفتح اوّل قدر و قیمت و شان و شکوہ حد و اندازہ کے معنوں میں آتا ہے زلیخا میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے اور شاہنامہ میں عنقا ہے۔ زلیخا ؎

(۱) زورج تو فرزانۂ یک دلہ — ہمہ حجلہ شد ساختہ ہم گلہ (ص ۲۷)

(۲) ہمی گفت ہر کس کہ از ورجِ او — کہ ایں بچگان اپلنگ است یو ہکست (ص ۲۹)

(۳) فروخفت تا از زمیں چترِ زر — برآمد بفیروزی و ورج و فر (ص ۱۱۱)

(۴) بخاصہ جوانی دل از بخت شاد — کہ باشد در و ورج و بخت و مراد (ص ۱۲۶)

(۵) کہ دادی مرا یوسفِ پارسا — کز و ملکِ من یافت ورج و بہا (ص ۱۵۳)

شاہنامہ اس کے بجائے ارج لاتا ہے۔ امثال ؎

(۱) کنوں اے خردمند ارجِ خرد — دریں جاے گہ گفتن اندر خورد (ص ۹) جلد اوّل

(۲) کہ او ارج زر را نداند ہمی — بہر جاے زر را فشاند ہمی (ص ۱۲۵) جلد سوم

(۳) یکے را مشی نامہ خوانید نیز — کزان جا و داں ارج یابید و چیز (ص ۱۱۲) ”

(۴) مرا ارج ایراں بباید شناخت — بزرگ آں کہ با نامداراں نساخت (ص ۱۲۸) ”

اگرچہ ارج اور ورج اصل میں ایک ہی لفظ ہیں اور ان کے معنی قدر و قیمت شان و شکوہ وغیرہ کے ہیں لیکن زلیخا میں ورج کے معنوں میں اور بھی عمومیت ہے۔ امثال اوّل و دوم میں ورج زیادہ تر برکت کرامت وغیرہ کے معنوں میں لایا گیا ہے۔

ہمزاد اِس کے معنی لغت میں ہم سن اور ہم سال ہیں ایسے رفیق پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو سفر و حضر میں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو۔ نظامی ؎

نگہ کرد ہمزاد او خفتہ بود — ہماں کرد با او کہ او گفتہ بود

(سکندر نامۂ بحری ص ۲۱)

مثنوی یوسف زلیخا میں عموماً برادر کا مرادف ہے۔ امثال از زلیخا سے

(۱) چو ہمزاد را آں چناں بستہ دید — دلِ خستہ از دیدہ بیروں چکید (ص ۹)

(۲) بدیدند ہمزاد خود را نژند — سراپائے گشتہ گرفتار بند (ص ۹)

(۳) تو ئی آں کہ ہمزاد را گرگ خورد — ترا از برادر چنیں فرد کرد (ص ۱۷۷)

(۴) منم آں کہ بر من ستم گرگ کرد — منم آں کہ ہمزاد را گرگ خورد (ص ۱۷۸)

زلیخا میں جب کہ وہ بیسیوں مقام پر ملتا ہے اور صاحب زلیخا کا روزمرّہ بن گیا ہے۔ تمام شاہ نامہ میں باوجود تلاش صرف ایک مثال داستان فرود میں ملی سے

کہ پیوند شاہست ہمزاد اوے — سوارے ست نام آور و جنگجوے (ص ۱۵۶) جلد اوّل

قابوس نامہ "کہ ملک ترا از برادرے مشفق ہمزاد و دوست تر است۔"

(باب چہل و دوم اندر شرط اسفہسالاری ص ۲۱۱)

استوار داشتن یا بودن اعتماد رکھنے کے معنوں میں زلیخا میں بالعموم رائج ہے۔ امثال سے

(۱) زبیم استوارش نبودی بکس — خود او را نگہدار بودی و بس (ص ۳۳)

(۲) بیا یوسفِ خویش را گوش دار — مدارش بہیچ آدمی استوار (ص ۳۶)

(۳) ہمی داروش روز و شب در کنار — ندارد بہر کس ورا استوار (ص ۳۷)

(۴) بکس یک زماں استوارش نبود — بجز خود شب و روز یارش نبود (ص ۹۹)

(۵) بہیچ آدمی استوارش نبود — شب و روز بے او قرارش نبود (ص ۱۶۵)

اِن معنوں میں شاہنامہ میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے۔ شاہ نامہ سے

(۱) پرستندہ بادے بیامد چہار — کہ خاقاں بدنیشاں بدی استوار (ص ۲۳) جلد چہارم

ساقِ عرشِ خدائے شاہ نامہ میں یہ ترکیب نامعلوم ہے اور زلیخا میں مقبول ہے۔ امثال سے

(۱) ز میداں چو بنہی قدم در سرائے — سر قبّہ بر ساقِ عرشِ خدائے (ص ۱۶۹)

(۲) خروشیدنِ کوس و زرینہ نائے — ہمی رفت تا ساقِ عرشِ خدائے (ص ۲۱۱)

(۳) یکے نور زاندام آں دلکشائے — بہ پیوست تا ساقِ عرشِ خدائے (ص ۶۰)

آہ اظہارِ تاسف وحسرت کے وقت زلیخا میں ملتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) بنالید وگفت آہ درد و دریغ — کہ خواہد شدن ماہ عمرم بہ میغ (ص ۳۲)

(۲) ہمی راند سیل و ہمی گفت آہ — کہ فالیست ایں بس سیاہ وتباہ (ص ۳۶)

(۳) چو یوسف چنیں دید بر جایگاہ — دلِ مہرباں برتنش گفت آہ (ص ۵۲)

(۴) بسے گفت مسکیں بسے گفت آہ — ز تیمار یعقوب دانش پناہ

(۵) پس آں اشک از دیدہا کرد پاک — برآورد آہ از دلِ دردناک (ص ۱۲۰)

(۶) ہمہ روز من گشت چوں شب سیاہ — شبم شیون و زاری و درد و آہ (ص ۱۷۴)

شاہ نامہ میں آہ کا لفظ کل چار پانچ مقام پر ملتا ہے اور ایسے نازک وقت پر جب کہ انسان کاری زخم کھاتا ہے جس سے جانبری محال ہے۔ سہراب کی موت، شاہ نامہ ؎

(۱) بہ پیچید زاں پس یکے آہ کرد — ز نیک و بد اندیشہ کوتاہ کرد (ص ۹۸) جلد اول

شغاد کی موت (۲) شغاد از پسِ زخم او آہ کرد — تہمتن بر و دست کوتاہ کرد (ص ۴۷) جلد سوم

بہرام چوبیں کا قتل (۳) چو بہرام گفت آہ مردم ز راہ — برفتند پویاں بہ نزدیک شاہ (ص ۹۶) جلد چہارم

معمولی تحسر اور تاسف کے وقت فردوسی بادِ سرد لکھتا ہے۔ شاہنامہ ؎

(۱) چو روئے پدر دید خسرو بدرد — برآورد از دل یکے بادِ سرد (ص ۶۶) جلد چہارم

(۲) بشد مغز و جان و سرم پر ز درد — برآورد از دل یکے بادِ سرد (ص ۱۸۱) جلد دوم

(۳) بیامد بہ نزدیک خاقاں چو گرد — پُر از خوں دل و لب پُر از بادِ سرد (ص ۱۸۹) ״

(۴) کز ایرانیاں چند جستم نبرد — نزد پیشِ من کس جز از بادِ سرد (ص ۲۲۴) ״

گویا قدما کی بادِ سرد کا قائم مقام متاخرین کے ہاں آہِ سرد ہے۔

دیژہ بیائے مجہول وزائے فارسی خاصہ وخالص وبیغش۔ اس صورت میں یہ لفظ دونوں مثنویوں میں ملتا ہے اور دونوں تصنیفات میں روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی جمع ویژگان ہے اس صورت میں خواص اور

ندما کے معنوں میں آتا ہے اور شاہنامہ میں بالعموم رائج ہے۔ امثال از شاہنامہ ؎

(۱)	خود و ویژگاں با ہیونان چست	بیامد بہ آسودگی راہ جست	(ص ۱۷) جلد سوم
(۲)	ازاں ویژگاں پنج تن را ببرد	کہ بودند با مغز و ہشیار و گرد	(ص ۲۸۷) جلد دوم
(۳)	چو از قلب شاپور لشکر براند	چپ و راستش ویژگاں انجواند	(ص ۱۰۰) جلد سوم
(۴)	ازاں پس خود و ویژگاں بر نشست	میان کئی تاختن را بہ بست	(ص ۹۶) ؍
(۵)	پس لشکر اندر ہمی رفت شاہ	خود و ویژگاں تا بہ نخچیر گاہ	(ص ۱۲۴) ؍
نظامی	یکے روز با خاصگان سپاہ	چو مینوی کے مجلس آراست شاہ	

ویژگاں یوسف زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے اور یہ امر قرین حیرت ہے کہ فردوسی اگر وہ یوسف زلیخا کا مالک ہے تو ویژگان کے استعمال سے اس مثنوی میں کیوں محترز ہے۔ اسی سلسلہ میں مجکو بویژہ کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے جو تاکید اور تخصیص کے لیئے آتا اور شاہنامہ میں علی العموم پایا جاتا ہے اور جس کو زلیخا میں قطعًا ترک کر دیا گیا ہے۔

بویژہ مرادف ہے بالخصوص کا شاہنامہ سے مثالیں اور بھی واضح کردینگی ؎

(۱)	بویژہ دلاور سپہدار طوس	کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس	(ص ۴) جلد اول
(۲)	ہمہ راستی خواہم و نیکوئی	بویژہ کہ سالار ایراں توئی	(ص ۵۶) جلد سوم
(۳)	مبادا کہ تنہا بود نام جوے	بویژہ کہ دارد سوے جنگ روے	(ص ۴۲) جلد چہارم
(۴)	یکے تاج بودی ازاں بر سرش	بویژہ کہ بیمار شد دخترش	(ص ۹۵) ؍
(۵)	کہ چونیں سخن نیست جز کار زن	بویژہ زنے کو بود رائے زن	(ص ۹۹) ؍

قرن پنجم میں بویژہ کا رواج گرشاسپ نامۂ اسدی ۴۵۸ھ سے ثابت ہے ؎

اسدی	بویژہ دو کس را بہ بخشاے و بس	مداں خوار و بیچارہ تر زاں دو کس

(ص ۱ طبع آقا محمد شیرازی بمبئی)

کیا یہ حقیقت حیرت بخش نہیں کہ بویژہ پر بھی زلیخا میں ویژگان کی طرح خط بطلان کھینچ دیا گیا ہے۔
مثنوی یوسف و زلیخا ایک بڑی کتاب ہے جو کم و بیش آٹھ نو ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس میں یہ قیاس کرنا

کہ بوشیرہ کے لیئے کوئی مناسب موقعہ اور محل نہیں ملا محل معلوم ہوتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کہیں اس کے استعمال کا موقعہ آتا ہے شاعر اس کا مرادف بخاصہ لاتا ہے چنانچہ زلیخا ؎

(۱)	بخاصہ کہ یوسف چو او آدمی	ندیدہ ہمی آسمان و زمی	(ص ۳۴)
(۲)	بخاصہ یکے بندۂ بے نوا	کہ ہجدہ درم باشد اورا بہا	(ص ۸)
(۳)	بخاصہ کہ از روم و چین آورند	نہ زین شہرہا وین زمین آورند	(ص ۱۰۹)
(۴)	بہ یوسف بر آزار واجب ندید	بخاصہ چناں کاں گواہی شنید	(ص ۱۳۰)
(۵)	بخاصہ ابر این یابین فرد	کہ گرگ از برادر ورا فرد کرد	(ص ۱۶۹)

قابوس نامہ " و با مردم ناداں صحبت مکن خاصہ با نادانی کہ پندارد داناست"۔

(باب ششم در فزونی گوہر در آموختن ص ۳۵)

حکیم سنائی جبذا آں جمالِ دہر آرائے مرحبا آں سپہر قلعہ کشائے

خاصہ وقتے کہ در مصاف بود پاے او بر دماغ قاف بود (حدیقہ ص ۶۵)

ارژنگ اس کی اور صورتیں یہ ہیں ارتنگ - اژنگ - ارجنگ - ارسنگ - ارغنگ - تنگ چینگ اور ژنگ - جس قدر اس کی شکل میں اختلاف ہے اسی قدر اس کے معنوں میں اختلاف ہے اور اہل قلم نے طرح طرح کی طبع آزمائیاں کی ہیں - بعض کا خیال ہے کہ ارژنگ مانی کا اصلی نام ہے ان کا اعتقاد ہے کہ مانی ایک دعائیہ کلمہ تھا جو کثرت استعمال سے بالآخر لقب ہو گیا - بعض کی رائے میں وہ کسی چینی بت خانہ کا نام ہے۔

بعض کا قول ہے کہ وہ اس تختہ یا کتاب کا نام ہے جس پر مصور اشکالِ غریبہ نقش کر کے اپنے سامنے رکھتے ہیں مصورانِ روم اس کو تنگ اور نقاشانِ چین ارتنگ بتائے قرشت (نہ بثائے تخذ، کیونکہ فارسی میں یہ حرف نہیں آتا) کہتے ہیں - (رشیدی) گویا یہ اسدی کو اصلاح دی گئی ہے جیسا کہ آیندہ دیکھا جائیگا -

بعض کا خیال ہے کہ اس کا اطلاق زبان پر بھی آتا ہے اور تاریخ کے معنی بھی دیتا ہے - (جہانگیری)

بعض کی رائے میں وہ کسی نقاش کا نام ہے جو چینی اصل اور مانی سے علیحدہ ہے اور کمال میں مانی کا ہم پایہ - امیر خسرو دہلوی ؒ ؎

گہ در چین دیدہ ام ارژنگ پُر کار　　کہ گردی دائرہ بے دَور پرکار

(ولہ)

بقصرِ دولتم مانی وارژنگ　　طرازِ نقش می بستند بر سنگ

امیر خسروؒ نے شاید یہ معنی نظامی سے لیئے ہیں ؎ نظامی

رواں کرد کلکِ شبہ رنگ را　　ببرد آب مانی و ارژنگ را

مگر قول مقبول یہ ہی کہ وہ مانی کے نگار خانہ کا نام ہی ؎ سیف اسفرنگ

اگر مانی شود زندہ چو بیند نقشِ توصیفش　　بمیرد باز از شرمِ نگارستانِ ارژنگش　　(جہانگیری)

استاد عمعق بخاری

ایں چوں بہار خانۂ چیں پُر ز نقشِ چیں　　واں چوں نگار خانۂ مانی پُر از بہار　　(لباب باب دہم ص ۱۸۶)

عطا بن یعقوب الکاتب المتوفی ۴۹۱ھ

بمانند بت خانۂ چین منقش　　بکردار ارژنگ مانی مصوّر

(لباب۔ حصہ اوّل۔ باب ششم۔ ص ۲)

متأخرین کا قریب قریب یہی عقیدہ ہی۔

لیکن سب سے قدیم اور وسیع عقیدہ جو متقدمین میں عام تھا یہ ہی کہ وہ مانی کی کتاب اشکال کا نام ہی۔ چنانچہ یہی معنی لغات اسدی میں دیئے گئے ہیں اور مثال میں فرخی کا یہ شعر منقول ہی ؎

ہزار بیک زان کاندر سرشت داد هنرت　　نگار و نقش نہ آنا کہ نیست در ارژنگ

اسدی نے ساتھ ہی یہ بھی تشریح کردی ہی کہ تاے قرشت کی بجاے زبان دری میں ثاے ثخذ سے لکھا جاتا ہی۔

وہ محض مرقع نہیں تھا بلکہ مصور کتاب تھی۔ فرخی کے اِس شعر سے اندازہ کیا جا سکتا ہی ؎

نامۂ فتح تو اے شاہ کنوں باید برد　　تا چوں میخوانند آں خوانند آرتنگ

مسعود سعد نے اس کو اور بھی واضح کردیا ہی ؎

دو نسخ آرد پرستشِ ایشاں　　راست ہستند نامۂ ارژنگ

ولہٗ

جہاں بزیب بزینت چولعبت آذر　　زمین بنقش و بصورت چو نامۂ ارژنگ

تنہا ارژنگ مسعود سعد سلمان کے ہاں یوں آیا ہے ؎

زاں کہ بستاں شدہ از حسن بسانِ فرخار　　زاں کہ صحرا شدہ از نقش بسانِ ارتنگ

سنائی کے ہاں بھی یہی معنی دیتا ہے ؎

گر نہ ارتنگ مانی است آں خط　　از چہ خطہاے مقلہ گشت سقط

ولہٗ

چشمِ بد دور سخت با معنی ست　　ہمچو ارتنگ خامۂ دکذا، مانی ست

(حدیقۂ سنائی صفحہ ۵۱، ۵۲، نولکشور ۱۸۸۶ء)

لیکن ابو المحاسن ازرقی کے ہاں گزشتہ معنوں میں سے کوئی بھی چسپاں نہیں ہوتا ؎

شگفت شاخِ سمن گرد بوستاں گوئی　　ہمی برآورد دُرِّ ثمیں سر از ارتنگ

(لباب باب دہم ص ۹۶)

آدم برسرِ قصّہ، یوسف زلیخا تنہا ارژنگ سے واقف نہیں لیکن اضافت کے ساتھ ارژنگِ مانی اس میں آتا ہے۔ زلیخا ؎

(۱)	سرو پاے او چوں بتِ آذری	چو ارژنگِ مانی و جانِ پری	(ص ۱۲۴)
(۲)	ہمہ لشکر و پیل چوں نو بہار	چو ارژنگِ مانی برنگ و نگار	(ص ۱۶۹)
(۳)	سرائے ست در پیش آراستہ	چو ارژنگِ مانی بہ پیراستہ	(ص ۱۶۸)
(۴)	بباہے درش پاے و درماہ سر	چو ارژنگ مانی ہمہ پر صور	(ص ۱۵۹)

اِن اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب یوسف زلیخا کے نزدیک ارژنگ خواہ مصوّر کتاب ہو یا نگارخانہ مانی سے علاقہ رکھتا ہو کیونکہ یہ مصنف ارژنگ کو مانی سے منسوب کیے بغیر لکھتا ہی نہیں۔ اس اعتقاد میں وہ سنائی، مسعود سعد سلمان، عطا بن یعقوب الکاتب، اسدی اور فرخی کا ہم زبان ہے۔

فردوسی شاہنامہ میں ارژنگ کو جن معنوں میں لاتا ہے ان سے عموماً نہ ہمارے ادیب اور نہ اہلِ لغات واقف معلوم ہوتے وہ حسب ذیل ہیں ؎

(۱) ارژنگ دیو مازندرانی اور تورانی پہلوان پسرِ زرہ کا نام ہونے کے علاوہ جیسا کہ صاحب جہانگیری نے لکھا ہے ایک اور تورانی پہلوان کا نام ہے جو نژاد کی فوج سے علاقہ رکھتا ہے۔ شاہنامہ ؎

یلانش بد ارژنگ مردِ دلیر — کہ ہرگز نبودند از جنگ سیر

("گریختن نژاد از بیژن و گرفتاری اسپنوی" ص ۱۶۰۔ جلد اول۔ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۲) ایک کنوئیں کا نام بھی ہے جس میں بیژن بن گیو افراسیاب کے حکم سے قید کیا جاتا ہے۔ شاہنامہ

بہ پیلانِ گردن کش آن سنگ را — کہ پوشد سرِ چاہ ارژنگ را

(داستان بیژن ص ۲۰۹ جلد دوم)

اور فرخی — نشستگاہ تو بر تختِ خسروانی باد — نشستگاہ عدوی تو بر چہ ارژنگ

(۳) وہ طلسم جادو اور نیرنگ کے معنی بھی دیتا ہے۔ جب فریدوں ضحاک کے ساختہ طلسم کو توڑ کر ضحاک کے محلسرا میں داخل ہو جاتا ہے اس واقعہ کی اطلاع کندرو ضحاک کو جا کر دیتا ہے اور کہتا ہے ؎

ترا دشمن آمد بگاہت نشست — یکے گرزہ گاوپیکر بدست

ہمہ بند و نیرنگ ارژنگ برد — دل آرام بگرفت و گاہت سپرد

(شاہنامہ۔ جلد اول ص ۱۳)

(۴) اور عموماً تصویر کے معنوں میں آتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ فردوسی شاہنامہ میں ارژنگ مانی کی ترکیب سے بالکل نابلد ہے۔ شاہنامہ میں یا تو تنہا ارژنگ ملتا ہے جیسے اس شعر میں ؎

یکے نامہ بنوشت ارژنگ وار — بر او کردہ صد گونہ رنگ و نگار

(نامۂ ژنگ بکیقباد و آشتی خواستن ص ۹۱ جلد اول۔)

نیز اس شعر میں ؎ (۲) یکے نامہ بنوشت ارژنگ وار — پر آرائش و رنگ و بوے و نگار

(فرستادن خاقان دختر خود را با نامہ و خواستہ ہمراہ مہربان بہ نزد نوشیروان۔ ص ۲۳ جلد چہارم)

اور اس شعر میں ؎

(۳) بخاقاں یکے نامہ ارژنگ وار ‌ ‌ ‌ ‌ نوشتند پر بوے و رنگ و نگار

(نامۂ بہرام چوبیں بخاقان و سکّہ بنام خسرو پرویز زدن و فرستادن آن نزد ہرمزد ص ۶۲ - جلد چہارم)

یا اضافت کے ساتھ ارژنگ چیں ملتا ہے جس کے معنی چینی تصویر لیے گئے ہیں۔ چنانچہ شاہنامہ ؎

(۴) یکے نامہ بنوشت پر آفریں ‌ ‌ ‌ ‌ سخندانِ چینی چو ارژنگ چیں

(آگاہی یافتن خاقان از رسیدن لشکر نوشیرواں بگرگاں و نامہ نوشتن او در بارۂ آشتی ص ۱۰ جلد چہارم)

اور یہ شعر ؎

(۵) یکے نامہ بر سانِ ارژنگ چیں ‌ ‌ ‌ ‌ بنشتند و کردند صد آفریں

(خواندن خسرو گردیہ را بدرگاہ ص ۲۰ جلد چہارم)

اِن اشعار میں ارژنگ کا اطلاق تصویر پر ہوا ہے اس کی تائید نظامی کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے ؎

(۱) یکے بود پیکر دو ارژنگ را ‌ ‌ ‌ ‌ تفاوت نہ ہم نقش و ہم رنگ را

(۲) کہ چوں کرد اندایں دو صورت نگار ‌ ‌ ‌ ‌ دو ارژنگ را در یکے ساں نگار

(مناظرہ رومیاں و چینیاں در صورتگری ۔ سکندر نامہ بری ص ۳۱۱ مطبع نامی لکھنؤ ۱۹۰۸ء)

یہ یاد رہے کہ فردوسی نے علی الرغم دیگر اساتذہ ارژنگ کو تصویر کے معنوں میں باندھا ہے جس میں نظامی کے سوا کسی اور نے اس کی تقلید بھی نہیں کی اور نہ یہ معنی کسی کتاب لغات یا فرہنگ میں پائے جاتے نظامی کے شارحین میں اِن ہی ابیات کی تشریح میں جو بیان درج ہیں ارژنگ کے معنوں سے متعلق بہت کچھ تذبذب اور پس و پیش ہے مثلاً پہلے شعر کی نسبت کہا گیا ہے " ازیں بیت صاف معلوم می شود کہ ارژنگ نام کار مصوران ست نہ نام نقاش نظیر مانی " اور سے در ارژنگ ایں نقش چینی پرند ‌ ‌ قلم بست بسانِ نقش بند - اسکندر نامہ بری ص ۲۵۴) کی شرح میں کہا ہے (حاشیہ ۵) " بداں کہ ارژنگ از شعر خسرو علیہ الرحمۃ معلوم می شود کہ نام نقاشے ست و دریں جا ایں معنی درست نمی شود و مراد از ارژنگ ایں جا نقاشے ست اسے در نقاشی چینی پرند "

دوسرے شارح نے اس قدر اور اضافہ کیا ہے کہ "ارژنگ نگارخانۂ مانی باشد" اور اس شعر کے واسطے ؎

زبس جادو یہائے فرہنگِ او   بدو بگرویدند وارژنگ او

کہا ہے کہ "ازیں بیت ہم ظاہر می شود کہ ارژنگ یعنی کارمانیت ای فنِ نقاشی وصنعتِ آں"۔ لیکن شعر نمبر (۲) کو جو اوپر لکھ آیا ہوں خاموشی کے چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ وہاں حضرت شارح کے مفروضہ معنی چسپاں نہیں ہوتے اصل یہ ہے کہ نظامی نے سکندر نامہ میں ارژنگ کو کل دو معنوں میں باندھا ہے پہلے وہ ہے جو ہم فردوسی کے ہاں دیکھ آئے ہیں یعنی تصویر دوسری وہی جو اسدی اور فرخی کے ہاں ملتی ہیں یعنی کتاب مانی۔

یہ تفاوت آسانی سے مفہوم ہو سکتا ہے کہ زلیخا میں ارژنگ یا نگار نامہ ہے یا نگارخانہ اور شاہنامہ میں تصویر اب یہ خیال کرنا کہ ایک مصنف نے اپنی دو تصانیف میں ایک لفظ کو دو مختلف معنوں میں باندھا اور جو معنی اور ترکیب ایک تصنیف میں اختیار کی دوسری تصنیف میں ترک کردی کوئی صحیح حجت معلوم نہیں ہوتی۔ فردوسی کے نزدیک اس کے معنی یا تصویر تھی یا کتاب اگر پہلے معنی تھے تو دونوں نظموں میں وہی معنی پائے جاتے اگر دونوں معنی جانتا تھا تو دونوں مثنویوں میں وہی معنی لاتا یہ کہا کہ ایک مثنوی میں ایک اور دوسری مثنوی میں دوسرے معنی لائے جائیں اور ترکیبیں بھی بدل دی جائیں، ایک میں کہے ارژنگ چیں اور دوسرے میں کہے ارژنگ مانی۔ شاہنامہ میں فردوسی کو ارژنگ مانی کے فقرہ کے استعمال سے اگر وہ اس سے واقف تھا کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی جس طرح کہ یوسف زلیخا میں ارژنگ چیں کے استعمال سے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان مثنویوں کے ناظم دو مختلف شخص ہیں جن کی معلومات مختلف ہیں فردوسی کی شخصیت کو صاحب زلیخا کی شخصیت سے امتیاز کرنے کے لیے ہمارے واسطے اسی قدر کافی ہے کہ وہ ارژنگ کو ایسے معنوں میں باندھتا ہے جو نہ صرف صاحب زلیخا بلکہ عام طور پر دیگر اساتذہ کو بھی معلوم نہیں۔

فرخی اور اسدی اگرچہ ارژنگ یا ارتنگ کو مانی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن فردوسی جو بحیثیت زمانہ ان دونوں شاعروں سے مقدم ہے نیز بحیثیت مؤرخ ایران مانی کے حالات سے مذکور الصدر شعرا کے مقابلے میں زیادہ باخبر ہونا چاہیئے ارژنگ کا مانی سے کوئی علاقہ تسلیم نہیں کرتا اگرچہ وہ مانی کی صورتگری کا معتقد ہے چنانچہ شاہنامہ ؎

بیامد یکے مرد گویا ز چیں	کہ چوں او مصوّر نہ بیند زمیں
بران چیرہ دستی رسیدہ بکام	یکے پرمنش مرد مانی بنام
بصورت گری گفت پیغمبرم	ز دین آوران جہاں برترم

(آمدن مانی مصوّر نزد شاپور بدعوے پیغمبری و کشتہ شدن او۔ ص ۱۰۱ جلد سوم)

اور نظامی سے ؎ شنیدم کہ مانی بصورت گری | ز ری سوئے چیں شد بہ پیغمبری

(سکندر نامۂ بری ص ۳۱۲)

مانی کی نسبت یہ عقیدہ عرب مورخین کے بیانات پر اعتبار کرتے ہوئے غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نہ فردوسی اور نہ مانی کی۔ عرب مورخ مانی کی مشہور کتاب ارژنگ یا ارتنگ کا ذکر کرتے ہیں اور فردوسی نہ شاہنامہ میں اور نہ مانی کے حالات میں کسی مقام پر بھی اس عام عقیدہ کا معتقد اور پابند نظر آتا ہے جس میں فرخی، اسدی، عطا بن یعقوب، مسعود سعد سلمان اور حکیم سنائی اعتقاد رکھتے ہیں۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر یوسف زلیخا فردوسی کے قلم سے نکلتی تو مانی کے متعلق یہ ایک غیر تاریخی بیان جو ارژنگ مانی کے فقرہ میں مرموز ہے فردوسی کے قلم سے ادا نہ ہوتا۔

نامہ۔ اس لفظ کے استعمال سے زلیخا میں کئی کنایے حاصل کیے گئے ہیں شاہنامہ میں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ زلیخا۔ امثال ؎

(۱) وگرنہ شود جانت جفتِ ہلاک | شود اسمت از نامۂ عمر پاک (ص ۱۳۰)

(۲) عزیزاں درون اوری خیرہ ماند | دلش نامہ و راہ اندیشہ خواند (")

(۳) بہفت آسمان رفرشتہ نماند | کہ او نامۂ درد یوسف نخواند (ص ۹۴)

(۴) تو لے با تو این نامہ را در نورد | بگرد سخنہائے بیہودہ مگرد (ص ۱۱۵)

(۵) دو رہ بر من این داستان خواندۂ | ہمیں نامہ بر من دو رہ خواندۂ (ص ۱۱۸)

ادائے مطالب شاہنامۂ عظیم کا مصنف فردوسی ہمارا خیال تھا کہ ادائے مطالب میں غیر محدود الفاظ گوناگوں بندشں اور ترکیب کے ذخیرہ کا مالک ہوگا اور جس طرح اور جس پہلو چاہتا ہوگا

اپنا مطلب ادا کر دیتا ہوگا۔ اس بارہ میں وہ ہم کو بالکل مایوس کرتا ہے۔ جب کوئی ایک خیال شاہنامہ کے دوران میں اس کو کئی مقام پر ادا کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے اظہار میں زیادہ تنوّع رنگا رنگی اور اختلاف سے کام نہیں لیتا بلکہ قریب قریب ان ہی الفاظ میں اس کو دُہراتا ہے جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ خیالات کی تکرار کے ساتھ الفاظ اور جملوں کی تکرار شاہنامہ میں اکثر مقامات پر مشاہدہ کی جاتی ہے۔ مثلاً میں ادائے سجدہ کے خیال کو لیتا ہوں۔ فردوسی اس مقصد کو ان صورتوں میں ادا کرتا ہے۔

(۱) نماز بُردن (۲) روئے بر زمیں مالیدن (۳) رُخ بر خاک نہادن (۴) روئے بر خاک مالیدن

(۵) رُخ بر تیرہ خاک مالیدن (۶) رُخ بر زمیں مالیدن (۷) رُخ بخاک مالیدن (۸) رخسارگان بر زمیں مالیدن

زلیخا شاہنامہ کے مقابلہ میں اگرچہ ایک مختصر نظم ہے لیکن اس مثنوی میں یہی مقصد ذیل کی شکلوں میں اظہار ہوا ہے۔

(۱) نماز بردن (۲) روئے زمیں بر رُخ ستردن (۳) روئے زمیں بچہرہ ستردن

(۴) روئے بر خاک تاری نہادن (۵) چہرہ بر خاک تاری بسودن (۶) رُخ بر خاک تیرہ بسودن

(۷) رُخ بر روئے زمیں نہادن (۸) رُخ بر زمیں نہادن (۹) چہرہ بر خاک تاریک مالیدن

(۱۰) رو بخاکِ سیہ مالیدن (۱۱) زمیں بچہرہ رفتن (۱۲) خاک زمیں بر ابرو رفتن

(۱۳) روئے بر خاک مالیدن (۱۴) رخ بر تیرہ خاک نہادن (۱۵) رُخسار بر تیرہ گِل مالیدن

(۱۶) دو رُخ بر زمیں نہادن (۱۷) چہرہ بر خاک مالیدن

اِسی طرح گستردن کا حال ہم دیکھتے ہیں۔ شاہنامہ میں عموماً اس فعل کے ساتھ یہ اسماء آتے ہیں۔

(۱) فرش گستردن (۲) دام گستردن (۳) کام گستردن (۴) مہر گستردن

(۵) پر گستردن (۶) آفریں گستردن (۷) داد گستردن (۸) کیں گستردن

(۹) بساط گستردن

زلیخا میں اس کے ساتھ مرقومۂ ذیل اسماء آتے ہیں۔

(۱) سخن گستردن (۲) آگہی گستردن (۳) بلا گستردن (۴) داستان گستردن

(۵) قصہ گستردن	(۶) خردمندی گستردن	(۷) گفتار گستردن	(۸) دیں گستردن
(۹) فرمان گستردن	(۱۰) نعمت گستردن	(۱۱) دعا گستردن	(۱۲) راز گستردن
(۱۳) نامہ گستردن	(۱۴) عاشقی گستردن	(۱۵) تخم گستردن	(۱۶) لابہ گستردن
(۱۷) دام گستردن	(۱۸) فرش گستردن	(۱۹) بساط گستردن	(۲۰) داد گستردن

اِن امثلہ سے دیکھا جا سکتا ہے کہ صاحبِ زلیخا کے ہاں جو رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے فردوسی میں اس کا نصف بھی نہیں۔ اِس سے فردوسی پر کوئی حرف گیری نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ ماننا ہوگا کہ زلیخا کے زمانہ میں فارسی زبان فردوسی کے عصر کے مقابلہ میں بدرجہا ترقی کر چکی تھی۔ جب کہ صاحبِ زلیخا کو اداے مطالب کے لیے ایک بے حد وسعت اور گنجائش مِل گئی ہے۔ فردوسی ایک محصور تنگنا میں سلسلہ برپا ہے۔

کسی اور موقع پر دونوں اُستاد اسے ایک مقصد کے اظہار میں ایک ہی پیرایہ کو دوہرا رہے ہیں۔ ذیل کی امثال سے روشن ہوگا کہ دونوں اُستاد کس قدر مغائر اور اپنی اپنی طرز میں مصر ہیں دونوں اسقدر کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں عہد سے فلاں عہد تک۔

یوسف زلیخا	شاہنامہ
از آدم درون تا بدین روزگار — نہان اند کردہ ایم آشکار	زگاہِ منوچہر تا کیقباد — ازان نامداران کہ داریم یاد [illegible]
از آدم درون تا بحشر گناہ ص۱۵ — بہ بخشی بیک رحمت ای دادخواہ	زگاہِ منوچہر تا کیقباد — زکاؤس تا شاہ فرخ نژاد [illegible]
از آدم درون تا بروزِ شمار ص۲۲ — ازین خوب تر کس ندیدست کار	زگاہِ منوچہر تا کیقباد — کسے دین یزدان نیاورد یاد [illegible]
از آدم درون تا بدین روزگار ص۱۵ — کہ او بود پیغمبرِ روزگار	زگاہِ کیومرث تا یزدگرد — بہ نظمِ من آید پراگندہ گرد [illegible]

فردوسی جب کہ معمولی اور صاف الفاظ میں اپنا مطلب ظاہر کر رہا ہے صاحبِ زلیخا اِسی مقصد کو ایک محاورہ کے ذریعہ سے ادا کرتا ہے یعنی از آدم درون تا الخ یہ ایک ایسی نادر صورت ہے جس سے فردوسی شاہنامہ میں قطعاً نابلد ہے البتہ گرشاسپ نامہ میں ہم اِس سے دوچار ہوتے ہیں ؎

اسدی — ز توران درون تا کہ گرشاسپ خاست — گزر کردہ بد چارصد سال راست

(گرشاسپ نامہ ص ۲۳)

علیٰ ہذا خواب دیکھنے کے مقصد کو فردوسی عموماً در حرف ظرف یا بائے ظرف کے ساتھ ادا کرتا ہے مثلاً در خواب دیدن یا بخواب دیدن - خال خال صورتوں میں حروف ظرف ترک بھی کر دیئے گئے ہیں لیکن اسقدر قلت کے ساتھ کہ کل شاہنامہ میں شاید دو تین مثالیں اس قسم کی ملیں - صاحب زلیخا اس مطلب کو بالعموم بلا وصل حروف ظرف خواب دیدن لکھتا ہے اگرچہ بعض اشکال میں وہ حروف ظرف بھی لاتا ہے - امثال از زلیخا ؎

(۱)	یکے خواب دیدم من ای شہریار	کہ ہرگز ندیدہ کسے در دیار	(ص ۴۲)
(۲)	دگر خواب دیدی کسے سخت و ست	پسندیدہ تعبیر کردی درست	(ص ۱۳۹)
(۳)	دلم دوش دیدہ است خوابی شگفت	ندانم چہ اندازہ باید گرفت	(")
(۴)	دگر گفت من خواب دیدم چناں	کہ بر سر کشیدم ہمی بار ناں	(ص ۱۴۰)

چند مثالیں شاہنامہ سے بھی نقل کی جاتی ہیں ؎

(۱)	چنیں دید در خواب کز کوہ ہند	درفشے برافراختندے بلند	(ص ۲۹) جلد اوّل
(۲)	بپرسید از دختِ افراسیاب	کہ فرزانہ شاہا چہ دیدے بخواب	(ص ۱۲۵) "
(۳)	چناں دید روشن روانش بخواب	کہ رخشندہ شمعے بر آمد ز آب	(ص ۱۷۰) جلد دوم
(۴)	چناں دید گوینده یک شب بخواب	یک جام مے داشتے چوں گلاب	(ص ۲) جلد سوم

اسی طرح ہاتھیوں کے پانوئیں روندے جانے کے خیال کو دونوں استادوں نے باندھا ہے - فردوسی کہتا ہے ؎

دگر ہیچ کژّے گمانے برم — بزیر پئے پیل تان بسپرم (ص ۳۳) جلد اوّل

زلیخا میں آتا ہے ؎

بزیر پئے پیل تاں افگنم — بن و بیخ تاں از جہاں برکنم (ص ۱۹۳)

ظاہر ہے کہ مدِ مقابل فقروں میں افعال سپردن اور افگندن میں فرق ہے اور سپردن افگندن کے مقابلہ میں زیادہ فرسودہ اور پارینہ معلوم ہوتا ہے -

کسی اور مثال میں دونوں استادوں کے خیالات ایک ہی سمت سفر کر رہے ہیں - فردوسی کہتا ہے ؎

و دیگر کہ از تو مگر کردگار — نشاید کیے کو دکم در کنار (ص ۸۶) جلد اوّل

صاحب زلیخا یہی مطلب یوں قلم بند کرتا ہے ؎

دعا کن مگر ایزد کردگار — نشاند مرا کو دکے در کنار (ص ۱۰۰)

مقابلہ دونوں آخری مصرعوں میں ہے اور فرق اس قدر ہے کہ فردوسی کے ہاں ترکیب ذرا پرانی ہے اور زلیخا میں مقابلۃً جدید۔

کنایات ومحاورات

ذیل کے محاورات جو زلیخا سے منقول ہیں شاہنامہ میں نظر نہیں آتے۔

(۱) خلیدہ جگر زیر دنداں ہا ربودن (۲) برآوردن درخت مراد از بن (۳) دار روے مہر کسے خوردن۔
(۴) چہرۂ بخت را طپانچہ زدن (۵) نامۂ چیزے در نوردن (۶) در عاشقی فرد کوفتن
(۷) گل دولت از باغ شادی چیدن (۸) ارزیز بر چشم بخت ریختن۔

اِن کی بندش کہہ رہی ہے کہ وہ ایسے وقت کی یادگار ہیں جب کہ زبان میں ایک معتد بہ حصّہ تک رنگینی اور حلاوت کی چاشنی پیدا ہو چکی تھی جو بات فردوسی کے عہد میں قلّت کے ساتھ معلوم تھی۔

برخلاف اِس کے شاہنامہ میں ایسے محاورات اور کنایات آتے ہیں۔

(۱) گلیم اندر آب افگندن (۲) گوز بر گنبد افشاندن (۳) آب در زیر کاہ بودن
(۴) طبل بزیر گلیم کوفتن (۵) گاو پیسہ بچرم اندر بودن (۶) ماہی بخشکی بردن
(۷) کار امروز را بفردا ماندن (۸) آب از تارک برتر گزشتن۔

شاہنامہ میں ایک کنایہ خشت خام در آب افگندن (کنایہ از کار بے سود کردن) آتا ہے۔ شاہنامہ ؎

چو کردار با ناسپاساں کنی — ہمی خشت خام اندر آب افگنی

زلیخا میں اس کے قریب قریب یوں آتا ہے شعر

ہر آں گہ کہ افتاد در آب خشت — مرا باک نبود ز باراں چو خشت

لیکن صاحبِ زلیخا کا مقصد بالکل مختلف ہے جس کو شاہنامہ میں کشتی بہ آب انداختن کے ذریعہ سے ادا کیا گیا ہے ؎

تو کشتی بآب اندر انداختی ز رستم ہمی چاکری خواستی (ص ۴۰) جلد سوم

لا اعلم مصرع
ہرچہ باد ا باد ما کشتی درآب انداختیم

فردوسی کے ہاں ایک اور کنایہ خورشید را چوں تواں نہفتن آتا ہے شاہنامہ ؎

یکایک بمرد گراں مایہ گفت کہ خورشید را چوں توانی نہفت (ص ۳۱) جلد اوّل

یوسف زلیخا میں اس کی شکل شمس اندوہ داشتن بگل میں تبدیل کرلی گئی ہے۔ زلیخا

کہ اولاد او فاینند (کذا) وخجل ہمی شمس اندوده دارد بگل (ص ...)

اسدی طوسی ؎ چنیں داد پاسخ بت دل گسل کہ خورشید پوشید نتواں بگل گرشاسپ نامہ ص ۱۰۱)

مولانا نظامی گنجوی برآشفت نوشابہ زاں شیر دل کہ پوشید خورشید را زیر گل

ولہٗ

کہ بامن چہ سود ست کوشیدنت بگل روئے خورشید پوشیدنت

(سکندر نامہ بری ص ۲۱۶۔ مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۰ء)

بہاء الدین محمد بن المؤید بغدادی یشعر

چو آفتاب یقینت شود کہ ز جرمم گر آفتاب بگل بشا زین خیدائی

(لباب باب ششم۔ ص ۱۴۱)

قاضی امام مجد الدین النسوی ؎

چو ماہ عمر تو اندر محاق پیری شد تو آفتاب حقیقت بگل چہ اندائی

(لباب۔ فصل دوم باب ہفتم ص ۲۴۵)

اس کنایہ کی آخری شکل یہ قرار پائی۔

"فصل فضل او اثبات کردن آب دریا بغربیل پیمودن بود وچشمۂ آفتاب را بگل اندودن"

(محمد عوفی۔ لباب الالباب فصل دوم از باب ہفتم ص ۲۲۹)

سعدی بگفت آنچہ دانست پاکیزہ گفت بگل چشمۂ خور نشاید نہفت (بوستاں)

امثال بالا سے ہم کو اس قدر علم ہو گیا ہے کہ کم سے کم فردوسی اور اس کا متبّع اسدی طوسی آفتاب بگل اندودن کے کنایہ سے واقف نہ تھے۔ یعنی اس کی یہ شکل ان ایام میں رائج نہ تھی۔ برخلاف اِس کے صاحب زلیخا اس محاورہ سے واقف معلوم ہوتا ہے جس کو بضرورتِ شعر "شمس بگل اندودن" لکھتا ہے۔

توصیفات

زلیخا میں اسمائے صفات ذیل کی صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) سپہرِ وفا آفتابِ ہنر (۲) کہ اے گلشنِ حسن و خورشید جاہ

(۳) خردمند لاوے چراغِ بصر (۴) چراغِ جہاں یوسفِ ژرف یاب (۵) ہنرمند یوسف چراغِ زمن

(۶) سرافراز راحیل پاکیزہ کیش (۷) بہ لبنائے پرمہر فرہنگ یاب (۸) زلیخائے مہ پیکرِ پیش بیں

(۹) نکونام یعقوب فرخ خصال (۱۰) رُخ روشنش کیمیائے جلال (۱۱) بوائے زلیخا بتِ سنگ دل

اِن میں اکثر مرکباتِ توصیفی اس قسم کے ہیں جن کو تشبیہی اضافات نے ترکیب دیا ہے شاہنامہ میں تشبیہی اضافات کا قلت کے ساتھ رواج دیکھا جاتا ہے اور ایسے مرکبات مثلاً کیمیائے جلال۔ گلشن حسن۔ چراغِ بصر۔ چراغ جہاں چراغِ زمن۔ چراغ دل اور فرہنگ یاب بالکل نامعلوم ہیں۔ چراغ کی تشبیہ زلیخا میں بالخصوص بہت عام ہے۔ شاہنامہ اِس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملی۔

علاوہ ازیں زلیخا میں دیکھا جاتا ہے کہ اسمائے صفات کے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام نہیں لیا جاتا۔

بعض مثالیں پیش ہیں زلیخا سے

بنزدیکِ خواں بدانش نشست کشیدش سوِ خوان فرہنگ دست (ص ۱۸۰)

یہ شعر اُس وقت آتا ہے جب کہ حضرت یامین حضرت یوسف کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں۔ خوان کے لیئے خوانِ دعوت، خوانِ نعمت وغیرہ مشہور صفات ہیں۔ شاعر نے ان سے احتراز کر کے خوان فرہنگ لکھا ہے۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ خوان کو فرہنگ سے کیا مناسبت ہے؟

کہ مسکیں زلیخائے فرہنگ جوے بدیں بندۂ خود سیہ کرد روے (ص ۱۳۰)

یہ وہ موقع ہے کہ عزیزِ مصر پر حضرت یوسف کی بے گناہی کا نقش جم جاتا ہے لیکن بدنامی کے خیال سے زلیخا کو بھی سزا دینا نہیں چاہتا۔ اِس موقع پر زلیخا کو فرہنگ جوئے کہنا کون سی خوش مذاقی کی دلیل ہے۔

ذیل میں کچھ امثال شاہنامہ سے پیش ہیں ؎

(۱) چمانندۂ دیزہ ہنگام گرد — چرانندۂ کرگس اندر نبرد
فزایندۂ باد آورد گاہ — فشانندۂ خوں ز ابرِ سیاہ
گرایندۂ تاج و زرّیں کمر — نشانندۂ شاہ بر تختِ زر (ص۳۵، جلد اوّل)

(۲) گرایندہ گرز و کشایندہ شہر — ز شادی بہر کس رسانندہ بہر
کشندہ درفشِ فریدوں بجنگ — کُشندہ سرافراز جنگی پلنگ (ص۳۹، جلد اوّل)

(۳) پناہِ گواں پشتِ ایرانیاں — فرازندۂ اخترِ کاویاں
سرافراز گردن کشِ پیل تن — سزاوار ہر شہر و ہر انجمن
خداوند نیروی و فرزانگی — نگہ دار گیتی بمردانگی (ص۴۷، جلد اوّل)

(۴) نبیرہ جہاندار کاؤس کے — دل افروز و پر دانش و نیک پے (ص۲۰۴، جلد دوم)

(۵) خداوند دولت خداوند زور — جہاں گیر و بخشندہ بہرام گور (ص۱۳۰، جلد سوم)

(۶) وزاں پس شود شہریاری بلند — جہاندار و نیک اختر و سودمند (ص۸۰، 〃)

(۷) سخن گوی و روشن دل و یادگیر — خردمند و دانا و گرد و دبیر (ص۴۰، جلد چہارم)

(۸) جہاندار با داد و نیکو کنش — فشانندۂ گنج بے سرزنش
فزایندۂ نام و تختِ قباد — گزارندۂ تاج دادر ندو داد (ص۳۸، جلد چہارم)

حرف عاطفہ کے ساتھ اسمائے صفات کو ترکیب دینا فردوسی کے ہاں زیادہ رائج ہے زلیخا میں یہ صورت خال خال موقعوں پر ملیگی - علی ہذا ایسی ترکیبیں مثلاً نشانندۂ شاہ - ستانندۂ گاہ - فشانندۂ گنج - گزارندۂ تاج - فزایندۂ نام - زلیخا میں غیر حاضر ہیں -

عربیت پیشتر ادعا کیا جاچکا ہے کہ زلیخا میں عربی الفاظ کی آمیزش ایک غیر ضروری حد تک دیکھی جاتی ہے یہاں اس مفہوم کو زیادہ وضاحت دینے کے ارادہ سے اِس قسم کی چند مثالیں دی جاتی ہیں -

امثال (۱) چنیں گفت الٰہی بآلائے خویش — باجلال و اعزاز و نعمائے خویش (ص۹۰)

(۲)	ہماں شہرہا و نواحی تمام	ہمہ ملک معمور با آں نظام	(ص ۱۵۱)
(۳)	چو بر شد بمنبر بدیں حسن و زیب	گسست از ہمہ خلق صبر و شکیب	(ص ۹۳)
(۴)	بدیں ظن زناں جملہ دیدند فرض	بد و خوشتین جملہ کردند عرض	(ص ۱۳۵)
(۵)	وفا دادہ بد مر براہیم را	مر آں اصل تبجیل و تعظیم را	(ص ۴۴)
(۶)	زنادانی آں خواب را خاص و عام	نہادند اضغاث و احلام نام	(ص ۱۴۴)
(۷)	مرا با چنیں حسن و چندیں جمال	نخواہی حدیثے ست صعب و محال	(ص ۱۱۴)

عربی الفاظ کی فارسی افعال کے ساتھ ترکیب کی مثالیں:۔ نظم آوردن۔ نظم آراستن لطف کردن۔ تضرع نمودن۔ فرح دادن۔ سفر افتادن۔ نسب ساختن۔ کفارت کردن۔ نقصان بودن۔ معزول کردن۔ مخذول کردن۔ تحیات کردن۔ عفو خواستن۔ فضل داشتن۔ عزت نہادن۔ منع کردن۔ فرو کردن۔ بضاعت داشتن۔ موقع فتادن۔ عقوبت رساندن۔ سیاست کردن۔ ضائع شدن۔ رسوم نہادن۔ عقد بستن۔ خطبہ خواندن۔ فلاح یافتن۔ اِن مرکب افعال میں سے اکثر شاہنامہ سے غیر حاضر ہیں۔

فارسی اضافت کے ساتھ عربی الفاظ کی ترکیب:۔ اصل تبجیل۔ عیب عظیم۔ تاویل احلام عزیز ذلیل۔ مالک رقاب۔ قرش عظیم۔ حرمتِ عظیم۔ کمالِ عظیم۔

عربی فارسی الفاظ کی ترکیب:۔ تعبیر خواب۔ رفے ایجاب۔ آیت دوری۔ کیش عظیم۔ جاہ عظیم نقش مانی۔ در عاشقی۔ نقشِ چینی۔ نامۂ عمر۔ سلبہائے زر۔ کار سمائی۔ گل معجزہ۔ خون فرزدر۔

اضافات کا استعمال:۔ قرصۂ شمس گیتی فروز۔ سررشتۂ صبر۔ قرصۂ آفتاب۔ شکر خدای جہان آفریں

فارسی حروف کے ساتھ عربی الفاظ کا استعمال:۔ ازیں نوع۔ بدیں نوع۔ بے مونس۔ قضا را بارضا۔ حرمتگہ۔ کثیر و قلیل۔ بے محابا۔ با نظام۔ اندک نظیر۔ گزشتہ بالا ترکیبوں میں سے جو زلیخا سے منقول ہیں۔ اکثر صورتیں شاہنامہ سے غیر حاضر ہیں۔

زلیخا کے برخلاف شاہنامہ میں عربیت کا اثر نہایت دُھندلا ہی اس کا اصلی سبب یہ ہی کہ فردوسی کے عہد تک فارسی زبان عربی کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔ ابتدائً صرف چند

ضروریات کی بنا پر عربی خرمن سے خوشہ چینی کی گئی تھی ان میں سب سے پہلے مذہبی ضرورت تھی اس بنا پر ہر مسلمان کے لیئے اپنے مذہبی مصطلحات کا جاننا ضروری تھا جو عربی تھیں مثلاً نماز - دعا - درود - سلام - حلال - حرام - حمد - ثنا - حدیث وغیرہ وغیرہ - دوسری اس عہد کی ضروریات زندگی کی بنا پر بھی عربی الفاظ کا ایک محدود اور ضروری ذخیرہ مستعار کیا گیا تھا مثلاً صندوق - شمع - منبر - قرطاس - قبر - قار - ملحم - معصفر - منزل - مجلس - صحرا - حرف - جمال - حُسن - عشق - عید - ساقی - قدح - تیسری ضرورت میں علمی اصطلاحات تھیں جن کے لیئے فارسی زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں تھا - مثلاً نظم - نثر - شعر - بیت - غزل - قصیدہ - خط وغیرہ وغیرہ - چوتھی قصائد میں شعرا لفظی شان وشوکت - لفاظی اور قوافی کی ضروریات سے بھی عربی الفاظ مستعار لیتے رہے تھے - تاہم یہ عربی ذخیرہ فارسی میں ایک محدود پیمانہ پر تھا اور اکثر ایسا تھا جس کے بغیر چارہ نہیں تھا -

شاہنامہ اس کی سب سے بہتر مثال پیش کرتا ہے - اس میں وہی عربی الفاظ ملتے ہیں جو مختلف ضروریات کی بنا پر فارسی میں رائج الوقت ہو چکے ہیں اور فارسی روزمرّہ میں داخل ہیں - ان میں سے بعض کی امثال اوپر دی جا چکی ہیں - علاوہ ازیں فردوسی خود بھی ایسے الفاظ عربی سے وام لیتا ہے جن کی اشد ضرورت محسوس کرتا ہے - مثلاً بیت اور نظم فارسی میں ان کا کوئی مرادف نہیں ملا اس لیے ان ہی پر متصرف ہو گیا - نظم ونثر کا ترجمہ اس نے پیوند اور پراگندہ کیا ہے لیکن ان پر خود اس کو اطمینان نہیں ہے قافیہ کی ضرورت سے بھی وہ گاہی گاہے عربیت کا منت پذیر ہوتا ہے مثلاً منجنیق شاہنامہ میں اس لفظ کے بغیر گزارہ دشوار تھا اس لیے وہ تو لے لیا لیکن قافیہ کی ضرورت سے ایک اور لفظ کی تلاش ہوئی فارسی میدان میں اس کی تجسس بے سود تھی ناچار عربی سے جاثلیق وام کیا - اب شاہنامہ میں جہاں کہیں قافیۂ اوّل منجنیق ہے قافیۂ ثانی بلا استثنا جاثلیق ہے - اسی طرح لفظ نیا (جد مادرے و پدرے) کے قافیہ کے لیئے کیمیا اور کف کے لیئے صف تلاش کیئے گئے -

یا بعض مصطلحات جنگ ہیں - مثلاً ساقہ - میمنہ - میسرہ - قلب - جناح وغیرہ ابتدا میں دقیقی کے تتبع میں فارسی راست - چپ - میان گاہ - پس پشت - یک دست اور دست دگر کی ترویج کی لیکن بعد میں ان کو ترک کر کے عربی اصطلاحات پر ہی قناعت کر لی - عربیت سے فردوسی کا اجتناب اس ایک چھوٹی سی مثال سے ظاہر

ہو جاتا ہے کہ مختصر اور بیش پا افتادہ الفاظ تعبیر و معبّر سے اعراض کرکے ان کی بجائے ایسے لمبے فارسی الفاظ مثلاً "گزارشِ خواب" "گزاریدنِ خواب" اور گزارندۂ خواب لاتا ہے قدما نے یہی سلوک "عید قرباں" کے ساتھ کیا ہے جس کو "جشنِ گوسفند کشاں" یا "عید گوسفند کشاں" کہا جاتا تھا۔ رودکی ؎

باد برتو مبارک و خنشاں جشنِ نوروز گوسفند کشاں

لیکن سلجوقی عہد سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ اقلیم زبان پر بھی انقلاب لاتا ہے اس دور کی نسلوں کا مذاق بدل چکا تھا۔ اس عہد میں دری فارسی یا خالص فارسی لکھنا بدمذاقی میں داخل تھا۔ عربی نمونوں کے مطابق سجع نے فارسی میں بھی اپنا قدم جمایا جس کے خلاف بعض حلقوں میں صدائے احتجاج بھی بلند کی گئی۔ نئے مذاق اور سجع پسندی نے زبان پر عربی الفاظ کا عنصر غالب کر دیا جس کے لیے کوئی خط حدبندی قائم نہیں تھا۔ اس زمانہ کے ادیب خالص فارسی لکھنے سے لوگوں کو مانع آتے تھے۔ امیر کیکاؤس قابوس نامہ میں لکھتا ہے:-

"و اگر نامۂ بود پارسی۔ پارسی مطلق منویس کہ ناخوش بود۔ خاصہ پارسی دری کہ نہ معروف بود" (باب سی و ہشتم)

عربی کے واسطے جو جنون اس دور میں محسوس ہو رہا تھا اس کی وسعت اس مثال سے مفہوم ہو سکتی ہے کہ قدما کے ہاں "شگفت ماندن" ایک عام محاورہ ہے۔ شاہنامہ ؎

زگفتارِ او ماند خسرو شگفت چو شرم آمدش پوزش اندر گرفت (ص ۶، جلد چہارم)

اب یہ محاورہ اگرچہ جاری رہتا ہے لیکن اس اصلاح کے ساتھ کہ شگفت ماندن کی بجائے عجب ماندن فروغ پایا اور میدان وقت گزرنے پر موخر الذکر ہی کے ہاتھ رہا۔

یہی سلوک قدما کے محاورہ "بند بستن" کے ساتھ کیا گیا ہے شاہنامہ ؎

(۱) بفرمود تا رفت مہراب پیش بہ بستند بندے بہ آئین و کیش (ص ۴۴، جلد اوّل)

(۲) بہ بستند بندے بہ آئین و کیش بدانساں کہ بود آن زمان دین و کیش (ص ۶)

متاخرین نے اس میں بھی یہی ترمیم کی کہ فارسی بند کو ترک کرکے اس کی جگہ عربی عقد کو رواج دیا۔ زلیخا ؎

بتزویج پیغمبر پاک دیں | بدیں پر ہنر دختر مہ جبیں
بخواں خطبۂ و عقد شاں بستہ کن | دلِ ہر دو شاں را ازہم رستہ کن (ص ۲۲۲)

آج بند بستن اسی قدر غیر معروف ہے جس قدر کہ اس کا متخلف عقد بستن یا عقد کردن مشہور ہے۔

زلیخا کی عربیت پر نظر ڈالتے ہوئے مشکل سے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ فردوسی یا اس کے عہد کی تصنیف ہو۔ کیونکہ جب شاہنامہ اِس نے زبان رائج الوقت میں لکھا ہے تو زلیخا کی زبان کو سکۂ رائج نہیں کہا جا سکتا۔ زلیخا کے عہد کی زبان پر عربیت زیادہ غالب تھی۔ اِن دونوں کی زبان کا فرق دکھانے کے لئے میں ذیل کی مثال پیش کرتا ہوں۔ شاہنامہ ؎

ازیں راز جانِ تو آگاہ نیست | دریں پردہ اندر ترا راہ نیست

(جلد اوّل ص ۵۸ تمہید داستانِ سہراب)

زلیخا | کس از سرّ ایں حکمت آگاہ نیست | دریں پردہ مخلوق را راہ نیست (ص ۱۵۱)

صاحبِ زلیخا نے اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق عربی الفاظ لاکر فردوسی کی زبان کی کھنگی کو برطرف کر دیا ہے۔ اور شعر پر اپنا قبضہ کر لیا ہے۔

شاہنامہ پر ایک سرسری نظر

اِس وقت تک تصویر کا ایک پہلو معائنہ کیا گیا ہے۔ تصویر کے دوسرے پہلو کے بغیر ہماری تحقیقات کا پورا مرحلہ طے نہیں ہو سکتا۔ زلیخا کے بعد ضروری ہوا کہ شاہنامہ پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے۔ اِس مثنوی کا سرسری مشاہدہ اس علم کے لئے کافی ہے کہ مصنّف یوسف زلیخا فردوسی کے ایسے کلمات اور فقرات سے جو شاہنامہ میں روزمرّہ کا حکم رکھتے ہیں اور فردوسی جن کی تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا، یوسف زلیخا کے دوران میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایسے سینکڑوں کلمات سے بخوفِ طوالت صرف چند نمونوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ابی۔ کلمۂ نفی بمعنی بی۔ امثال از شاہنامہ ؎

(۱)	ابی آں کہ بد اہیچ بیمار ئیے	نہ از درد ہا ہیچ آزار ئیے	(ص ۲۵، جلد اوّل)
(۲)	ہمہ چیں بروزار و گریاں شدند	ابی آتش از درد بریاں شدند	(ص ۹۶، جلد چہارم)

شاہنامہ میں اگرچہ عموماً مستعمل ہے زلیخا سے قطعاً خارج کر دیا گیا ہے۔ اسدی ؎

ایے آفتابا ترا چیست حال چنیں تیرہ شب دل گرفتم ملال

(گرشاسپ نامہ ص۲ - طبع آقا محمد شیرازی بمبئی)

ایدوں - بمعنی اکنوں و چنیں شاہنامہ ؎

(۱) من ایدوں گمانم کہ تو مادری سر با نوانی و ہم مہتری (ص۱۰۵، جلد اوّل)

(۲) ہمی مردم ناسزا را دہی من ایدوں شنیدم کہ جائے مہی (ص۱۱۴، جلد چہارم)

یہ لفظ بھی زلیخا سے غیر حاضر ہے اور اسدی کے ہاں موجود ہے ؎

من ایدوں ز طبعم بہار آورم مراین شاخ را تو ببار آورم (ص۱۱، گرشاسپ نامہ)

چناں چوں - یہ ترکیب قدما کے ہاں اکثر رائج ہے۔ دقیقی ؎

نوشتم من این نامۂ شاہوار چناں چوں بود درخور شہریار

(شاہنامہ ص۴ جلد سوم)

فردوسی (۱) بیاید ز بازار مردے ہزار چناں چوں نہ زیبندۂ کارزار

(شاہنامہ ص۱۳ جلد سوم)

(۲) چناں چوں بدم کہتر کیقباد کنوں از تو دارم دل و مغز شاد

(شاہنامہ ص۳۲ جلد سوم)

اسدی ز دل برکشد می تف درد و تاب چناں چوں بخار از زمیں آفتاب (ص۱۵، گرشاسپ نامہ)

زلیخا میں متروک ہے۔

تفت - بمعنی گرم - شاہنامہ میں عام طور پر ملتا ہے۔ امثال ؎

(۱) سپہ بد بدز روئے بنہاد تفت بکردار بازارگاناں برفت

(شاہنامہ جلد سوم ص۲۳)

(۲) مغا توره از پیش خاقاں برفت بیامد سوئے خرگہ خویش تفت (شاہنامہ جلد چہارم ص۸۵)

اسدی   وزآں جا سپہ راند و بشتافت تفت   بشادی بشہر زنجاب رفت   (گرشاسپ نامہ ص۵۹)

زلیخا میں رائج ہیں۔

یارمند شاہنامہ میں عام طور پر ملتا ہے امثال ؎

(۱)   بدارندۂ آفتاب بلند   کہ باشم شما را بدو یارمند

(شاہنامہ۔ جلد چہارم ص۴۳)

(۲)   نخواہم کہ آید شما را گزند   مباشید با من بہ بد یارمند   (ص۱۲۳) جلد چہارم

اسدی   بود کاخترت یارمندی کند   ہمہ دشمنت دل نژندی کند

(ملحقات شاہنامہ ص۹)

گمانیدن۔ امثال از شاہنامہ ؎

(۱)   گمانند کیں بیشہ پر خوں شود   ز دشمن زمین رود جیحوں شود   (ص۱۲۱) جلد چہارم

(۲)   از اں کو ہم آواز وہم کیش ماست   گمانم کہ قیصر تن خویش ماست   (ص۱۰) ؍

اسدی   ز رستم ہمی چونکہ خواہی شنود   گمانے کہ چوں او دبردی نبود   دگرشاسپ نامہ ص۱۰)

زلیخا میں نظر نہیں آتا۔

گرایدونکہ۔ قدما کے ہاں یہ ترکیب مستعمل ہے۔ دقیقی ؎

گرایدونکہ بپذیرد او پند ما   نساید ہمی پائے او بند ما

(شاہنامہ جلد سوم ص۴)

فردوسی   گرایدونکہ از دشت نیزہ وراں   بنالد کسے از کراں تا کراں

(شاہنامہ جلد چہارم ص۵)

(۲)   گرایدونکہ بازآرد آں را کہ گفت   گناہ گزشتہ بباید نہفت

(شاہنامہ۔ جلد دوم ص۱۹۰)

زلیخا میں مہجور الاستعمال معلوم ہوتا ہے۔

درایدونکہ - زلیخا میں سکّۂ غیر رائج ہی۔ دقیقی ؎

درایدونکہ نپذیری این پندِمن بسائی گران آہنیں بندِ من

(شاہنامہ، جلد سوم ص۴)

فردوسی درایدونکہ زیں کاہستم گناہ جہاں آفرینم ندارد گناہ

(شاہنامہ جلد اوّل ص۱۰۰)

(۲) درایدونکہ پیراں کند دست پیش بخواہد سپہ یاور از شاہِ خویش

(شاہنامہ جلد دوم ص۱۲۸)

ارایدونکہ قدما اکثر یہ ترکیب استعمال میں لاتے ہیں - دقیقی ؎

ارایدونکہ بپذیری این نیک پند زترکاں بجانت نیاید گزند

(شاہنامہ جلد سوم ص۴)

فردوسی بدو گفت ارایدونکہ کین نیا بجوئی نداری بدل کیمیا

(شاہنامہ جلد سوم ص۱۵)

(۲) ارایدونکہ پیراں نخواہد نبرد بانبوہِ لشکر بیارد چو گرد

(شاہنامہ جلد دوم ص۲۳۵)

زلیخا میں نامعلوم ہی۔

برآنہم نشاں - یعنی ہماں طور، شاہنامہ میں یہ ترکیب کثرت سے ملتی ہی زلیخا میں نہیں ملتی ؎

شاہنامہ بریزند خونش برآنہم نشاں کہ او ریخت خون سر سرکشاں (ص۵۸) جلد چہارم

(۲) برآں ہم نشاں تا قبادِ بزرگ کہ از دادِ او میش شد خویش گرگ (ص۹۸) ؎

تنگ اندر آمدن - نزدیک آمدن، بالعموم شاہنامہ میں آتا ہی۔ شاہنامہ ؎

چو جاماسپ تنگ اندر آمد زجاہ ورا باز دانست فرزند شاہ (ص۴۴) جلد سوم

(۲) دو لشکر چو بن تنگ اندر آمد زراہ از انسو سپہدار ازیں سو شاہ (ص۱۶) جلد چہارم

مثنوی زلیخا میں یہی مقصد یوں ادا ہوا ہے ؎

(۱) شدم تا بہ نزدیک آں شہر تنگ — کہ ناگہہ برآمد یکے بوے و رنگ (ص ۱۰۶)

(۲) بگفت این و تنگ اندروں شد برش — کہ بوسہ بباید زدو شکّرش (ص ۱۰۹)

فرماں کردن۔ اطاعت کردن۔ شاہنامہ میں کثرت کے ساتھ آتا ہے۔ امثال ؎

(۱) چنیں داد پاسخ کہ فرماں کنم — بدیں آرزو جاں گروگاں کنم (ص ۲۸۳) جلد دوم

(۲) اگر باژ خواہی تو فرماں کنیم — بنوے یکے باز پیماں کنیم (ص ۵۳) جلد سوم

زلیخا میں غیر مستعمل ہے۔

بزار۔ اسے بزاری۔ شاہنامہ میں آتا ہے۔ امثال ؎

(۱) خروشے برآمد ز ایراں بزار — جہاں شد پر از نام اسفندیار (ص ۴۴) جلد سوم

(۲) کہ بگریستی بر مسیحا بزار — دو رخ سرخ و مژگاں چو ابر بہار (ص ۷۹) جلد چہارم

زلیخا میں معدومیت کا حکم رکھتا ہے۔

کیمیا۔ حیلہ و تدبیر۔ شاہنامہ میں عموماً نظر آتا ہے۔ امثال ؎

(۱) یکے آں کہ گفتی کہ کین نیا — بجستم من از چارۂ و کیمیا (ص ۲۶) جلد سوم

(۲) بزین اندر افگند گرز نیا — پر از جنگ سر دل پر از کیمیا (ص ۲۱۲) جلد دوم

زلیخا اس لفظ سے واقف نہیں۔

پیراں سر۔ لے پیرانہ سر۔ شاہنامہ امثال ؎

(۱) مگر باز گردد ز بد نام من — بہ پیراں سراں بد سر انجام من (ص ۲۱۳) جلد دوم

(۲) نہ بینی کزیں بے ہنر دخترم — چہ رسوائی آمد بہ پیراں سرم (ص ۲۰۹) ؍؍

دست بکش کردن اسے دست بر سینہ نہادن۔ شاہنامہ میں عموماً آتا ہے۔ امثال ؎

(۱) بکاخ اندروں شد پرستار وش — بر شاہ بر دست کردہ بکش (ص ۲۰۹) جلد دوم

(۲) بفرمود تا لنبک آب کش — بر شاہ بر دست کردہ بکش (ص ۱۱۴) جلد سوم

زلیخا میں نایاب ہے۔

گروگان کردن اے گروگردن بالعموم شاہنامہ میں ملتا ہے اور زلیخا میں نادر ہے امثال از شاہنامہ ؎

(۱) شما داد جوئید و فرماں کنید — رواں را بہ پیماں گروگاں کنید (ص ۶۰) جلد سوم

(۲) ہمہ پیش تو جاں گروگاں کنیم — زدیدار تو رامش جاں کنیم (ص ۱۶) ″

بادگشتن شاہنامہ میں عموماً نظر آتا ہے اور زلیخا میں نہیں ملتا۔ امثال ؎

(۱) کنوں آں چہ بد بود برما گزشت — گزشتہ ہمہ نزد من بادگشت (ص ۱۶) جلد سوم

(۲) بدارا بگفت آنچہ اندر گزشت — چناں داں کہ یکسر ہمہ بادگشت (ص ۵۳) ″

باد درمشت یا بدست ماندن۔ شاہنامہ کا عام محاورہ ہے۔ امثال ؎

(۱) کہ مارا کنوں جان بپاسپ اندرست — چو سستی کند باد ماند بدست (ص ۵۶) جلد سوم

(۲) سپاہ اندر آید پس پشت من — نماند بجز باد درمشت من (ص ۲۲۲) جلد دوم

(۳) بگیرند گردن کشاں پشت اوے — نماند بجز باد در مشت اوے (ص ۲۲۹) ″

(۴) بدیں شہر دوریشی و رنج ہست — ازیں بگزری باد ماند بدست (ص ۶) جلد سوم

زلیخا میں معدوم ہے۔

ہوش باز آوردن۔ زلیخا میں نظر نہیں آتا۔ شاہنامہ ؎

(۱) چنیں داد پاسخ کہ باز آر ہوش — کہ من پور قیدافہ ام قید روش (ص ۶۷) جلد سوم

(۲) بدو گفت گرگیں کہ باز آر ہوش — سخن بشنو و پہن بگشائے گوش (ص ۲۱۰) جلد دوم

کام کژی خاریدن شاہنامہ میں دیکھا جاتا ہے اور زلیخا ناواقف ہے امثال ؎

(۱) بجاں اشبےداد مت زینہار — بایواں سی کام کژی فخار (ص ۳۹) جلد سوم

(۲) چنیں گفت باشاہزادہ نخوار — کہ بامردمی کام کژی فخار (ص ۱۰۹) جلد چہارم

آب از تارک برتر گزشتن شاہنامہ ؎

(۱) زتارک مرا آب برتر گزشت — غم و شادمانی ہمہ بادگشت (ص ۹۶) جلد چہارم

(۲) سپہ اند کوشش سخن در گزشت | زتارک دم آب برتر گزشت | (ص ۵۵) جلد سوم

کسے را بکس نداشتن شاہنامہ ؎

(۱) بگیتی ندارد کسے را بکس | تو گوئی کہ نوشیروان ست و بس | (ص ۱۷) جلد چہارم

ندارد زشاہاں کسے را بکس | چہ کہتر چہ از شاہ فریاد رس | (ص ۲۱)

کس بکس نشمردن۔ شاہنامہ ؎

(۱) زمردی و گردی بانگ برید | ازیں مرز کس را بکس نشمرید | (ص ۱۲۸) جلد سوم

(۲) زدیدار من گوے بیروں برد | ازیں انجمن کس بکس نشمرد

زلیخا میں عنقا ہے۔

بیدار دل باش و روشن رواں ایک قسم کی دعا ہے جو شاہنامہ میں اکثر آتی ہے۔ امثال ؎

(۱) سپہ آفریں خواند بر پہلواں | کہ بیدار دل باش و روشن رواں | (ص ۱۸۱) جلد دوم

(۲) چنیں داد پاسخ بدو پہلواں | کہ بیدار دل باش و روشن رواں | (ص ۱۶۹) ؍

زلیخا میں نامعلوم ہے۔

کلید و بند اِن کی ترکیب سے شاہنامہ میں کئی محاورے بنائے گئے ہیں۔ امثال ؎

(۱) خبر چوں بہ نزدیک توراں رسید | مر آں بند را ساختہ شد کلید | (ص ۱۰۹) جلد اوّل

(۲) ستم بر سیاوش از ایشاں رسید | کہ نو آمد ایں بند بد را کلید | (ص ۱۸۷) جلد دوم

(۳) بسے بر نیاید کہ پاسخ رسید | یکے نامہ بد بند او را کلید | (ص ۲۶) ؍

(۴) منوچہر ازاں تخمہ آمد پدید | شد آں بندہا را سراسر کلید | (ص ۱۲۶) جلد چہارم

زلیخا میں مطلق غیر حاضر ہے۔ نظامی کے ہاں بند کے بجائے قفل آتا ہے۔

آب و جوی اِن کی ترکیب سے شاہنامہ میں کئی محاورے ملتے ہیں۔ امثال ؎

(۱) بمنذر چنیں گفت بہرام گور | کہ اکنوں کہ شد آب در جوی شور | (ص ۱۰۹) جلد سوم

(۲) یکے چارہ سازم کہ بدگوے من | تراند بزشت آب در جوی من | (ص ۵۶)

(۳) چنیں گفت رستم کہ ایں روے نیست ره آبرواں بدیں جوے نیست (ص ۲۰۰) جلد دوم

(۴) ہمہ زیں شمارند ایں روے نیست مرایں آب اور جہاں جوے نیست (ص ۱۸۹) "

بادِ سرد از جگر کشیدن فردوسی شاہنامہ میں اس محاورہ کا بہت مشتاق معلوم ہوتا ہے اور بار بار اس کو دُہراتا ہے اور تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا۔ میں صرف چند امثال پر قناعت کرتا ہوں حیرت ہے کہ فردوسی کا نہایت مقبول محاورہ زلیخا سے بالکل متروک ہے۔ شاہنامہ ؎

(۱) چو پیغام گرگیں برستم رسید یکے بادِ سرد از جگر بر کشید (ص ۲۱۳) جلد دوم

(۲) یکے بادِ سرد از جگر بر کشید بسوئے گلہ دار قیصر کشید (ص ۲۸۰) "

(۳) بدو داد پس گنجہا را کلید یکے باد سرد از جگر بر کشید (ص ۴۹) جلد سوم

(۴) چو رومی سر و تاج کسریٰ بدید یکے بادِ سرد از جگر بر کشید (ص ۴۲) جلد چہارم

محاکمہ تصویر کے دونوں پہلو امتحان کرنے اور گزشتہ بیانات کو ذہن میں رکھنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ شاہنامہ اور یوسف زلیخا کی زبان میں وہ فرق بیّن موجود ہے جو کسی صورت میں ایک وقت کے دو معاصرین کی زبان میں تصوّر نہیں کیا جا سکتا چہ جائے کہ ایک ہی مُصنّف کی زبان میں خیال کیا جائے اِس لیئے ہم مجبور ہیں کہ اُن کو دو شخص مانیں اور وہ بھی ایسے مختلف العصر اور مختلف الوطن ہوں۔ اور ہمارے وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دونوں مثنویوں کی مخصوصی خط و خال جو ایک مصنف کی جملہ تصنیفات کا عام جوہر ہونا چاہیئے باہم مشترک نہیں مثلاً ابی۔ ایدوں۔ گرایدونکہ۔ درایدونکہ۔ کیمیا۔ پیراں سر۔ برآں ہم نشاں۔ نژاد۔ گردگاں کردن۔ باد درشت ماندن۔ کس بکس شمردن یا سرد از جگر کشیدن وغیرہ وغیرہ جن سے شاہنامہ کے ۰۰ ان میں سلسلے التواتر ہم روشناس ہوتے رہتے ہیں زلیخا میں ابتدا ہی سے نامعلوم ہیں علی ہذا زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً بکوئی۔ خوار بار۔ حلدی۔ ہمزاد۔ غریو و غرنگ۔ بند کشائے وغیرہ وغیرہ شاہنامہ میں ایک نامعلوم کمیت کا حکم رکھتے ہیں

(۲) بعض مفرس الفاظ مثلاً ملکت۔ عفو۔ لطف۔ مشوم۔ عمدا۔ عماری۔ مشاطہ کی ترویج بظاہر سلجوقی

عہد میں ہوئی ہی اسی لیئے اِس دور کے شعرا میں انکا رواج زیادہ پایا جاتا ہی۔ مثلاً منوچہری۔ ناصر خسرو۔ اسدی۔ امیر معزی۔ مسعود سعد سلمان۔ عثمان مختاری۔ حکیم سنائی۔ عمعق بخاری۔ ادیب صابر وغیرہ۔ فردوسی جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا جاتا ہی ان الفاظ کے لیے کم سے کم قاعدۂ تفریس سے بالکل بے خبر ہی اور جب زلیخا میں ان کا رواج ہی تو بدیہی ہی کہ سلجوقی دور میں کسی وقت لکھی گئی ہوگی۔

(۳) بعض محاورے مثلاً گوش داشتن، گرہ بر زدن جب کہ فردوسی کے ہاں اکثر لغوی معنوں میں آتے ہیں مثنوی یوسف زلیخا میں کنایات کا درجہ حاصل کر کے کچھ اور ہی مفہوم ادا کرتے ہیں اور یہ بات ایک عہد میں حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۴) بعض محاورے جو زلیخا میں بالعموم نظر سے گزرتے ہیں فردوسی ان سے واقف معلوم نہیں ہوتا مثلاً صورت بستن۔ عتاب برداشتن۔ دل برگماردن۔ گرمی نمودن۔ گمان زدن وغیرہ ان کی صورت کہہ رہی ہی کہ ہماری ولادت فردوسی کے عہد سے بہت عرصہ بعد ظہور میں آئی جب کہ تکلّف اور رنگینی زبان میں شائع ہو چکی تھی۔

(۵) بعض الفاظ جب کہ شاہنامہ میں رائج ہیں، زلیخا میں مہجور الاستعمال معلوم ہوتے ہیں اور ان کی بجائے اور لفظ لائے گئے ہیں مثلاً بوشرہ اور ویژگان شاہنامہ میں ملتے ہیں اور زلیخا میں پہلے لفظ کی بجائے بخاصہ آتا ہی۔ شاہنامہ کے بند بستن کی بجائے زلیخا میں عقد بستن ملتا ہی۔ شاہنامہ کے بادِ سرد کا قائم مقام زلیخا میں آہ ہی۔ اور شاہنامہ کے گذاریدن خواب کے بدلے زلیخا میں تعبیر ملتا ہی۔ اِن سے معلوم ہوتا ہی کہ شاہنامہ اور زلیخا کی زبانوں میں بہت فرق ہی۔ اگر شاہنامہ فردوسی کی زبان کا معیار صحیح ہی تو زلیخا فردوسی کے قلم سے ہرگز ہرگز نہیں لکھی گئی۔ کیونکہ فردوسی کے لیے یہ خیال کرنا کہ جب وہ آفتاب لبِ بام اور پا بلب گور ہو رہا تھا اُس وقت اپنی تازہ تصنیف زلیخا کے لیئے نیا اسلوب نئی اصطلاحات اور نئے معانی ایجاد کر رہا تھا ایک ناممکن اور محال عقیدہ ہی۔

(۶) دونوں اساتذہ کی وطنیت میں بھی اختلاف ضرور پایا جاتا ہی۔ ہمارے پاس اس خیال کے مؤید یہ قرائن ہیں فردوسی شاہنامہ میں ساربان کو ہمیشہ سارواں لکھتا ہی۔ زلیخا میں ساربان آتا ہی۔ اب ساربان اور

سارواں ایک ہی خطۂ ملک میں نہیں بولی جا سکتی۔ علیٰ ہذا ارج اور ورج ایک ہی شہر میں نہیں بولے جا سکتے جس وطن میں خرید و فروخت بولنے کے عادی ہیں وہاں خرید و فروش رائج نہیں ہو سکتا۔ جس شہر میں کارگر معاً کے معنی دیتا ہے وہاں یہ لفظ ملازم کے معنی نہیں دے سکتا جس وطن میں آذین بستن عوام میں بولا جاتا ہے وہ آئین بستن نہیں کہینگے۔ اور غریویدن جہاں ... شور اور فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے وہاں اس کو گریہ و زاری کے معنوں میں نہیں بولینگے۔ علیٰ ھذا پرس اور پرسش ایک جگہ نہیں بولے جا سکتے۔ اسی طرح پوشیدن بجائے پوشانیدن پرہیزیدن بجائے پرہیزانیدن اور شنیدن بجائے شنوانیدن ایک وطن کی بولیاں نہیں ہیں۔ اگر فردوسی کے وطن میں یہ الفاظ جو زلیخا میں ملتے ہیں بولے جاتے تھے تو فردوسی شاہنامہ میں ان کو ضرور لاتا اور یہ مابہ الامتیاز فرق دونوں تصنیفات میں نہ پایا جاتا لیکن اس فرق کی موجودگی دلیل ہے اس امر کی کہ دونوں استاذہ کی وطنیت میں اختلاف ہے۔

(۷) بعض محاورے اور الفاظ جب کہ دونوں مثنویات میں مشترک ہیں اُن میں یہ امتیاز دیکھا جاتا ہے کہ زلیخا میں جب کہ وہ روزمرّہ بن گئے ہیں شاہنامہ میں من قبیل شاذ لائے گئے ہیں۔ مثلاً گوش داشتن تخت زدن۔ ہمزاد۔ قضارا۔ اُستوار وغیرہ۔ اس سے یہی عقیدہ مستنبط ہوتا ہے کہ دونوں اُستاد مختلف العہد ہیں۔

(۸) بعض امثال کے ذریعہ سے دکھایا جا چکا ہے کہ فردوسی جس حالت میں کہ اداے مطالب کے لیے ایک محدود میدان میں کدوکاوش اور تنگ ودو کرتا نظر آتا ہے صاحب زلیخا ایک فضائے بسیط پر قابض اور متصرف معلوم ہوتا ہے اس سے یہی احتمال ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کو ایک مدت دراز ایک دوسرے سے جُدا کر رہی ہے اور فارسی زبان اس عرصہ میں ترقی کر کے بہت کچھ وسیع ہو چکی ہے۔

(۹) فردوسی اور صاحب زلیخا کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک دلیل یہ بھی ہے کہ دونوں استاذہ کی معلومات میں فرق ہے۔ فردوسی ارژنگ کو جادو نیرنگ اور تصویر کے معنوں میں لاتا ہے اور یہ معنی ایسے ہیں جن سے صاحب زلیخا واقف تک نہیں۔ یہ بہت غیر مشہور معنی ہیں اور دیگر اساتذہ بھی عام طور پر نہیں جانتے۔ شاہنامہ میں ارژنگ پانچ موقعوں پر تصویر کے معنوں میں آیا ہے اس تکرار سے ظاہر ہے کہ فردوسی کے نزدیک یہی معنی تھے وضاحت کے خیال سے "ارژنگ چین" بھی لکھ دیا ہے۔ تاکہ کسی کو مانی کی ارژنگ کا

دہوکا نہ ہو۔ فردوسی اگر یوسف زلیخا لکھتا تو کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی معلومہ معنی زلیخا میں ارژنگ کو نہ دیتا۔ زلیخا میں "ارژنگ مانی" چار مقام پر آیا ہے اور ہر مقام پر مانی کی کتاب یا مانی کے نگارخانہ کے معنی دیتا ہے۔ لیکن شاہنامہ والے معنی کبھی بھول کر بھی نہیں آتی۔ کیا بقول شاعر ؎

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

فردوسی کو اسی برس کی عمر کے بعد زلیخا تصنیف کرتے وقت محقق ہوا کہ ارژنگ مانی کی کتاب کا نام ہے نہ تصویر اور نیز جو معنی اس نے شاہنامہ میں دکھلائے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فردوسی مانی کی تاریخ سے واقف ہونے کی بناء پر مانی کی کتاب ارژنگ کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ اسی لیئے شاہنامہ میں اس کا ذکر نہیں کرتا اور اگر زلیخا لکھتا تو اس میں بھی اس قسم کی غلطی کے ارتکاب سے پرہیز کرتا۔

(۱۰) یہاں کچھ منٹ کے لیئے میں اپنی مبحث اصلی سے اعراض کر کے چند الفاظ ایک نئے مضمون کے متعلق کہنا چاہتا ہوں اس سے میرا مقصد اسدی اور اس کا گرشاسپ نامہ ہے۔ اسدی کے متعلق ہمارے ہاں بہت کچھ غلط بیانیاں رائج ہیں اکثر اس کو فردوسی کا اُستاد مانتے ہیں۔ نیز شاہنامہ داستان یزدگرد خاتم تاجدار عجم سے خاتمہ تک اسدی کا نظم کردہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ناقابل تسلیم قصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں پورے اٹھاون سال کا تفاوت ہے۔ گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ ہجری میں تصنیف ہوا ہے چنانچہ گرشاسپ نامہ ؎

ز ہجرت بدور سپہری کہ گشت
شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت

گرشاسپ نامہ کا عہد معلوم کر کے سب سے پہلے ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا بحیثیت عمر گرشاسپ نامہ متقدم ہے یا مثنوی یوسف زلیخا۔

گرشاسپ نامہ اور مثنوی یوسف زلیخا میں بعض الفاظ اور محاورے عام ہیں مثلاً از آدم دروں تا الخ تخت زدن۔ کلہ زدن۔ قضارا۔ مشاطہ۔ غریو وغرنگ۔ اب یہ الفاظ زلیخا گرشاسپ نامہ سے لے رہی ہے یا گرشاسپ نامہ زلیخا سے، اس کا تصفیہ یوں ممکن ہے کہ "قضارا" زلیخا میں اس کی مکمل شکل میں ملتا ہے جیسے

بوستاں میں لیکن گرشاسپ نامہ میں وہ محض قضا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ "قضا" اور "قضا مرا" میں قضا زیادہ قدیم ہے اسی طرح "بویژہ" شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں عام ہے لیکن زلیخا میں متروک ہے اور اس کا قائم مقام "بخاصہ" لایا گیا ہے۔ ان میں ظاہر ہے کہ "بویژہ" قدیم ہے اور "بخاصہ" جدید اس استدلال سے یہ قرینہ برآمد ہوتا ہے کہ زلیخا گرشاسپ نامہ کے بعد کی تصنیف ہے لیکن اس قیاس کو درجۂ یقین تک ارتقا دینے کے لیئے ہمیں شاہنامہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ میں ایسے الفاظ مثلاً ابی - ایدوں - بویژہ - چنانچوں تفت - یارمند - گمانیدن وغیرہ عام ہیں لیکن یہی الفاظ مثنوی یوسف و زلیخا میں مہجور الاستعمال ہیں - اگر زلیخا گرشاسپ نامہ سے مقدم ہوتی تو یہ الفاظ اس میں قطعی پائے جاتے چونکہ زلیخا میں موجود نہیں اس سے یہی قابل پذیرائی نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ گرشاسپ نامہ کے دور میں رائج تھے لیکن زلیخا کے عہد میں متروک مانے جا کر آرایشِ طاقِ نسیاں بنا دیئے گئے تھے اس سے زلیخا پر گرشاسپ نامہ کا تقدم ثابت ہوتا ہے جب گرشاسپ نامہ کا تقدم ثابت ہو گیا تو شاہنامہ کا تقدم خود بخود ظاہر ہے کیونکہ شاہنامہ تو اسدی کی تصنیف سے پورے اٹھاون سال بڑا ہے۔

(۱۱) ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کے محاورہ اور روزمرہ کے بیسیوں کیا بلکہ سینکڑوں الفاظ صاحب یوسف و زلیخا کے نزدیک مہجور الاستعمال ہیں اور یہ ہمیں ماننا ہوگا کہ سینکڑوں کی تعداد میں الفاظ اور کلمات ایک قلیل مدت یا مہلت میں قلم و زبان سے اخراج نہیں پا سکتے - کیونکہ زبان کسی ایک شخص کی ملک نہیں ہے وہ تمام قوم اور ملک کی زبان ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ جب تک تمام قوم کسی کلمہ یا لفظ کو اپنی گفتگو سے خارج کرنے پر آمادہ نہو جائے وہ کلمہ ترک نہیں ہو سکتا - ہزاروں بشر ایک دم قتل اور ہلاک کیئے جا سکتے ہیں اور لاکھوں نفوس چند لمحوں میں صفحۂ ہستی سے محو کیئے جا سکتے ہیں لیکن الفاظ کا قتل عام اِس طرح عمل میں نہیں لایا جا سکتا اِن کی اگر موت ہوتی ہے تو اکثر طبعی ہوا کرتی ہے جب کہ ملک کو اُن کی ضرورت نہیں رہتی اور ان سے بہتر جانشین اور قائم مقام پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً فردوسی کا "خورشید چوں تواں نہفتن" اسدی کے ہاں "خورشید بگل نتواں پوشیدن" بنا اور یوسف زلیخا میں "شمس بگل اندودہ داشتن" بن کر لباب لالباب میں "چشمۂ آفتاب بگل اندودن" بن گیا۔ وقس علیٰ ذالک - فردوسی کی ضرب الامثال "بفرداممان کار امروز را" اور "آب از تارک برگذشتن"

اصلاح پاکر موجودہ شکل میں "کارِ امروز بفردا مگزار" اور "آب از سر گزشتن" بن گئے۔

مختصر یہ کہ الفاظ اور محاورات کا روزمرّہ سے اخراج ایک دردوراز عمل ہی اور یہ عمل عمروں میں ختم ہوتا ہی سینکڑوں کلمات اور محاورات کا اقلیم زباں سے اخراج اور اس کا عمل دس بیس پچاس سال کا کام نہیں ہی بلکہ صدیوں کا۔ اِس سے میرا مقصد شاہنامہ اور یوسف زلیخا کے زمانوں کی طرف ایما کرنا ہی جن کے درمیان میں میری رائے میں کم و بیش ایک اور نصف صدی کا فاصلہ حائل ہی۔

زلیخا کی عصرِ تصنیف کو ایک خاص مدت میں حصر کرنے کے لئے میرے پاس دو قرینے ہیں پہلا گرشاسپ نامہ اسدی ۴۵۸ھ اور یہ پیشتر دکھایا جاچکا ہی کہ زلیخا بلحاظ عصر گرشاسپ نامہ سے متاخر ہی دوسرے سکندر نامہ مولانا نظامی گنجوی جو ۵۹۷ھ ہجری میں تصنیف ہوا ہی ؎

بتاریخ پانصد نود ہفت سال
کہ خوانندہ را زو نگیرد ملال

سکندر نامہ اور زلیخا میں مادّہ فارق کی جستجو کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً "ابا" معنی با۔ "ابر" معنی بر۔ "کجا" (بالکسر) (اُردو میں جس کے معنی جو۔جب۔جہاں۔ اور جیسے ہونگے) خوانند راندند اور افشاندند۔ (جن کے پڑھتے وقت پہلا نون بضرورت شعری پورا ظاہر کرنا ہوگا قدما میں یہ رواج بہت عام تھا مثلاً انوری ؎

اختراں را شوکتت بر سمت طاعت راندہ
آسماں را نعمتت در زیرِ فرماں یافتہ

اِس میں راندہ کا نون بضرورت وزن پورا ظاہر کرنا ہوگا)۔ سکندر نامہ میں یک قلم متروک ہیں۔ اگرچہ یہ کلمات زلیخا کے عہد میں بھی آفتاب لبِ بام کا حکم رکھتے ہیں کیونکہ دیکھا جاتا ہی۔ زلیخا میں وہ بہت کمی کے ساتھ آتے ہیں مثلاً کجا صرف پانچ مقام پر ملتا ہی اور خوانند وغیرہ صرف دو موقعوں پر ملتے ہیں اِس سے یہی قیاس کیا جاتا ہی کہ زلیخا کی ایّامِ تصنیف میں ہی متروک ہو چلے تھے۔ آمدم بر سر قصہ جب یہ الفاظ زلیخا میں موجود ہیں اور سکندر نامہ میں غیر حاضر تو ظاہر ہی کہ سکندر نامہ زلیخا سے بعد کی تصنیف ہی اور زلیخا کا عصر سکندر نامہ سے مقدم ہی۔

اس طرح قرن ششم کے منتصف اوّل میں زلیخا کی تصنیف کے واسطے ہماری نگاہ جمتی ہی۔

حدیقۂ حکیم سنائی جو ۵۲۴ھ و ۵۳۵ھ کے درمیان لکھا گیا ہی چنانچہ حدیقہ ؎

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام

پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

اگرچہ بعض آثار اور علامات سے پایا جاتا ہی کہ وہ زلیخا کی ہم عہد ہی لیکن بعض خط و خال اس قسم کے ہیں جو حدیقہ پر زلیخا کے تقدم کو ثابت کرتے ہیں مگر اس سے میرا اسی قدر مقصد ہی کہ قرنِ سادس کا منتصف اوّل زلیخا کی ولادت کا بہتر زمانہ ہو سکتا ہی۔ اِن ہی ایّام میں زلیخا کی تصنیف منضبط کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک اور قرینہ ہی اور وہ یہ ہی کہ:-

علاوہ اور اسالیب یامی کے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہی زلیخا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہی کہ جب افعال معطوف و معطوف علیہ آتے ہیں فعل معطوف علیہ عام اِس سے کہ واحد ہو یا جمع۔ غائب ہو یا حاضر یا متکلّم فعل معطوف بصیغۂ واحد غائب لایا جائیگا۔ امثال ؎

شعر

قبا بست و چابک نوردیدہ دست

قبایش دریدند و دستش شکست

(بوستانِ سعدیؒ ۶۵۵ھ)

اِس مثال میں دریدند کی تبعیت میں شکستند لایا جاتا۔

مثالِ دیگر

"اسعاف ملتمس او را رحمہ اللہ لازم شمردم و اجابت دعوتش فریضۂ دانست" المعجم فی معابیر اشعار العجم من شمس الدین محمد بن قیس ۶۱۴ھ۔ (اس مثال میں فریضہ دانستم آنا چاہیئے تھا)۔

مثالِ دیگر

زندہ شد مردمیِ حاتم و مردے رستم

چوں بہ بزم اندر نشستی و برزم اندر خاست

لطیف الدین زکی مراغۂ در مدح معز الدین سنجر حسین بن علی۔ (کتاب۔ باب یازدہم ص ۳۰۶)

اِس مثال میں خاستی ہوتا۔

مثالِ دیگر

از پائے در فتادم و از دست شد کہ چشم

روزے ندید از تو مراعات سرسری

محمد بن علی الکاشانی (لباب باب ہفتم ص۱۹۴)۔ اِس مثال میں از دست شدم آتا۔

مثالِ دیگر

دادی بوصلِ وعدہ و آنگہ بطنز گفت

چیزے کہ کس نیافت تو از من مدار چشم

جمال الدین الازہری المروزی (لباب فصل دوم از باب ہفتم ص۲۱۵)۔ اِس مثال میں گفتی موزوں تھا۔

مثالِ دیگر

"ویکے از لطافتِ طبعِ او آں بود کہ مطائباتی کہ در حقِ او گفتہ بودند یاد داشتی وحکایت کرد"

محمد عوفی۔ (لباب الالباب۔ باب یازدہم ص۳۹۳)۔ یہاں حکایت کردی درست تھا۔

مثالِ دیگر

"آں اسیراں را اگر بریں جملہ کہ فرمودیم باوطان و بلاد خویش نرسانند ویک کودک بازگیرند ہر چہ پرانیدیم
وتعلم آورد۔ و بنوشت جملہ بجا آوریم۔"

نامۂ سلطان سنجر بعظیم الروم از انشائے معین امم (لباب۔ تعلیقات میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ص۳۱۷)
یہاں بتعلم آوردیم و بنوشتیم لایا جاتا۔

یہی اسلوب مثنوی یوسف وزلیخا میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ امثال سے

(۱) چو فارغ شد از پند و اندرز مرد — بہ بستند پیمان و سوگند خورد (زلیخا ص۵۱)

یہاں بہ بستند کی تبعیت میں سوگند خوردند لایا جاتا۔

(۲) نہ سوگند خوردی و پیماں گرفت — گوا بر تن خویش یزداں گرفت (زلیخا ص۵۳)

اِس مثال میں گرفتی لایا جاتا۔

(۳) گرستند و یک چند زاری نمود ولیکن گرستن نبی داشت سود (ص۱۸) زلیخا

اس موقع پر زاری نمودند کہا جاتا۔

(۴) سراسر بدان دہ برادر سپرد ہمہ راہ کنعاں گرفتند و برد (ص۲۰۵) ؎

اس مقام پر بردند آتا۔

میں یہاں اِس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلوب شاہنامہ سے مطلق غیر حاضر ہی نہ گرشاسپ نامہ حدیقۂ سنائی اور سکندر نامہ میں پایا جاتا۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہی کہ تمام ممالک ایران میں اس کا رواج نہیں رہا ہی بلکہ خاص خاص خطوں میں جن میں ماوراءالنہر کا نام قابلِ ذکر ہی کیونکہ امثلۂ بالا کے اکثر قائل ماوراءالنہری ہیں مثلاً محمد عوفی۔ محمد بن علی الکاشانی اور لطیف الدین زکی مراغۂ۔ جوں جوں خروجِ چنگیز خاں کا زمانہ قریب آتا جاتا ہی یہ اسلوب اور بھی مقبول ہوتا جاتا ہی حتیٰ کہ قرنِ سابع کے رُبع اوّل کے مصنّفیں کے ہاں اس کو ایک ممتاز پایہ مل گیا ہی۔ اور بقول علّامہ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی یہ اسلوب غریبہ لباب الالباب جوامع الحکایات تذکرۃ الاولیاء فریدالدین عطّار اور المعجم فی معابیر اشعار العجم میں عام طور پر رائج ہی۔

گزشتہ امثال میں اس اسلوب کا سب سے پرانا نمونہ معین الدین اصم دیوان انشائے سلطان سنجر کے ہاں ملتا ہی چونکہ یہ سلطان سنجر سلجوقی کا عصر ہی اس لیئے اسی دَور میں مثنوی یوسف و زلیخائے فردوسی بھی کسی وقت تصنیف ہوئی ہوگی جس کا مصنّف بھی غالبًا ماوراءالنہری ہوگا۔

صاحبِ زلیخا کی مضمون دُزدی

فردوسی کے مضمون دُزدوں میں اسدی۔ امیر کیکاؤس بنائی نظامی۔ سعدی۔ خسرو اور جامی کا نام تو سرداستان ہی لیا جاسکتا ہی۔ اِن کے علاوہ اور بھی نامعلوم ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے فردوسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہی اور جو آج گوشۂ خمول میں بالش نشیں ہیں اِن میں سے میں اپنے مضمون کے حدود اندازہ کو نگاہ رکھتے ہوئے یہاں صرف صاحبِ زلیخا کی مضمون دزدی کے انکشاف پر قناعت کرتا ہوں۔

مُصنفِ یُوسف زلیخا ایسا اندازہ کیا جاسکتا ہی کہ شاہنامہ سے بخوبی واقف تھا کیونکہ وہ فردوسی کی مشہور شعروں کی اکثر نقالی یا مقابلہ کی کوشش میں مصروف دیکھا جاتا ہی یہ ایک اور غیر مترقبہ تائید ہی ہمارے اِس

دعوے کی کہ مصنّفینِ شاہنامہ و یوسف زلیخا دو مختلف ہستیاں ہیں کیونکہ فردوسی کی نسبت یہ خیال کرنا کہ زلیخا کے دوران میں وہ اپنے مشہور اشعار کی ایک تبذل قسم کی نقالی کرنے لگا تھا بعید از عقل ہوگا۔

ذیل میں چند امثال پر جو بلا مزید تفحص میری معلومات میں آئیں قناعت کی جاتی ہے اگر توجہ سے اور تلاش کی جائیگی تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فہرست المضاعف ہو جائیگی۔

یوسف زلیخا (طبع طہران)	شاہنامہ (طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)
مرا خوشتر آید بزندان دروں ص۱۳۶ بزیرِ زنخ دست کردہ ستوں	ورا دید با دیدگاں پُر زخوں ص۲۵ ج۲ بزیرِ زنخ دست کردہ ستوں
کسے کو گریزد ز خورشید و ماہ ۔ چگونہ کند سوئے اختر نگاہ	دلِ من چو شد بر ستارہ تباہ ص۳۲ ج۱ چگونہ تواں شاد بودن بماہ
چو من بودمے بر سرِ کارِ خویش ص۱۱۴ دلم بستہ بر شغل بازارِ خویش	بدیں بندی از من میازار بیش ص۲۱۴ ج۲ کہ دل بستہ بودم ببازارِ خویش
ازیں ہر دو تن راست گفتار کیست ص۱۲۹ وزیں نرّ و مادہ گنہگار کیست	ببینم کزیں دو گنہگار کیست ص۱۰۵ ج۱ بباد آفرہ بر سزاوار کیست
دعا کن مگر ایزدِ کردگار ص۱۰۷ نشاند مرا کودکے در کنار	و دیگر کہ از تو مگر کردگار ص۹۶ ج۱ نشاند یکے کودکم در کنار
بہر ہفت کشور دروں کس نماند ص۱۹۶ کہ او نامۂ نامِ نیکت نخواند	بگیتی جز از پاک یزداں نماند ص۸۱ ۔ کہ منشورِ تیغِ ترا بر نخواند
کس از سرّ ایں حکمت آگاہ نیست ص۱۵۱ دریں پردہ مخلوق را راہ نیست	ازیں از جانِ تو آگاہ نیست ص۸۵ ۔ دریں پردہ اندر ترا راہ نیست
بزیرِ پئے پیلتاں افگنم ص۱۶۳ بن و بیختاں از جہاں برکنم	و گر ہیچ کژّے گمانے برم ص۳۴ ۔ بزیرِ پئے پیلتاں
بہ آرامگہ شد ہمہ دام و دد ص۱۸۲ بخفتند ہر جانور نیک و بد	نہ آوائے مرغ و نہ ہرّائے دد ص۱۰۵ ج۲ زمانہ زباں بستہ از نیک و بد
ز کشور بکشور سپاہت بود ص۱۱۸ فلک زیرِ فرّ کلاہت بود	ز دریا بدریا سپاہِ ویست ص۲۴۴ ۔ جہاں زیرِ فرّ کلاہِ ویست
شب و روز بادت چنیں ارجمند ص۱۹۶ ز چشمِ بدانت مبادا گزند	بکامِ تو بادا سپہرِ بلند ص۲ ج۳ ز چشمِ بدانت مبادا گزند
بدل گفت خورسند گردم برنج ص۱۹۴ کہ در رنج باشد سرانجام گنج	برنج اندرست اے خردمند گنج ص۲ ج۱ نیابد کسے گنج نابردہ رنج
از آغاز بنوشت نامِ خدائے ص۲۰۳ کہ بودہ است و ہموارہ باشد بجائے	سرِ نامہ کرد آفرینِ خدائے ص۶۵ ج۳ کجا ہست و باشد ہمیشہ بجائے
ہمی داشتش صد رہ از جاں فزوں ص۳۰۸ از اندازۂ مہربانی فزوں	ہمی داشتم چوں یکے تازہ سیب ص۲ ج۲ کہ از باد نامد بمن بر نہیب
دگر روز ہنگام بانگ خروش ص۲۱۰ بغرّید بر درگہہ شاہ کوس	شبگیر ہنگام بانگِ خروس ص۲۹ ج۳ ز درگاہ برخاست آوائے کوس
ز آئینۂ پیل و ہندی درائے ص۱۶۲ خروشِ نوا رفتہ تا دور جائے	ز بس نالۂ بوق و کوس و درائے ص۱۶۳ ج۱ ہمی آسماں اندر آمد ز جائے

ان امثال سے ناظرین پر یہ بھی روشن ہو سکتا ہے کہ صاحب یوسف زلیخا نے فردوسی کی طرز آڑانے میں ایک بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے لیکن شاہنامہ اور یوسف زلیخا کا پایہ نظم کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جدت اور معنی آفرینی جوش اور برجستگی جو فدائے سخن کا حصہ ہے زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے۔ مجکو کل دو تین شعر زلیخا میں پسند آئے ؎

(۱) زمین زان کند فخر بر آسماں — کہ دارد زنعل سمندت نشاں (ص ۹۵)

(۲) بناخن گرہ بافت از مشکناب — در آویخت از گوشۂ آفتاب (ص ۱۲۲)

حدائق البلاغت میں آخری شعر فردوسی کے نام پر ہی نقل کیا ہے۔ نظامی کے ہاں اسی مضمون پر اور ان ہی قوافی میں مجکو تین شعر ملے ؎

(۱) نہ گیسو کہ زنجیر از مشکناب — فروہشتہ چون بری از آفتاب

(سکندر نامہ بری ص ۲۰۶ طبع مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۰ء)

(۲) شکن گیر گیسوش از مشکناب — زدہ سایہ بر چشمۂ آفتاب (سکندر نامہ بری ص ۱۸۶)

(۳) کمر بستۂ زلف او مشکناب — کہ زلفش کمر بستہ بر آفتاب (″ ″ ″ ص ۳۲۹)

اور سچ تو یہ ہے کہ نظامی کی تینوں کوششیں اس شعر کے مقابلہ میں ناکام رہی ہیں۔

ذیل میں کچھ مثالیں اس قسم کی دی جاتی ہیں جن میں فردوسی اور صاحب یوسف زلیخا کو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کرتے دیکھا جاتا ہے۔ ان مثالوں میں شاہنامہ سے مقابلہ کی خاطر مجکو زلیخا سے کچھ اشعار نکال دینا پڑے ہیں اور ایک مقام پر ایک شعر اضافہ کیا ہے۔

یوسف زلیخا	شاہنامہ
تن پاک پیوستہ دارم بتو — دل مہرباں بستہ دارم بتو	من اینک بہ پیش تو استادہ ام — تن و جان شیریں ترا دادہ ام
بہر ساں کہ فرمان دہی بر سرم — ترا چوں پرستندہ فرماں برم	زمن ہر چہ خواہی ہمہ کام تو — برآرم نہ پیچم سر از دام تو
پانچ شعر کے بعد	
بگفت این و تنگ اندر دِں شد برش — کہ بوسہ بباید زدو شکرّش	سرش تنگ بگرفت و یک بوسہ داد — ہمانا کہ از شرم نا در دیاد

چو یوسف چنیں دید برپاے جست
ز دستِ زلیخا بروں برد دست
کہ داند کہ از شرم چوں بود چوں
کہ از شرم رخسارِ وے شد چو خوں
چناں گشت لرزاں ز بیم خدائے
ندل ماند باوے نہ دانش نہ رائے
(آمدن زلیخا نزدِ یوسف و صحبت داشتن ص ۱۰۹)

رخانِ سیاوش چو خوں شد ز شرم
بیاراست مژگاں بخوناب گرم
چنیں گفت با دل کہ از کارِ دیو
مرا دور دارا د گیہاں خدیو
رفتن سیاوش بارِ دوم پیش سودابہ صفحات ۵-۱۰۴ ج ۱

از آغاز تا دیدہ ام چہرِ تو
گرفتارہ اندر کفِ مہرِ تو
نماندست زیں پیش آرام دل
ہمی داد خواہی مرا کام دل
سہ سال ست تا زار و دلختہ ام ص ۱۱۹
ابا آتش و آب پیوستہ ام
گرامروز با من شوی سازگار
درختِ مرادِ من آری ببار
بہ برہنم پایہ تختِ ترا
کنم بندہ خورشید بختِ ترا
زشاہاں سرت را کنم تاجدار
کمر بستہ پیشت جہاں بندہ وار
اگر سر تابی ز پیوندِ من
نیاری دلِ خویش در بندِ من
چو دیوانہ زیں خانہ تازم بروں
بہ تیرہ چہ اندر رفتم سرنگوں
رفتن زلیخا در آں عمارت و طلب نمودن یوسف و بستن درہا را ص ۱۲۳

کہ تا من ترا دیدہ ام مردہ ام
خروشان و جوشان و آزردہ ام
ہمی روز روشن نہ بینم ز درد
برآنم کہ خورشید شد لاجورد
کنوں ہفت سالست تا مہرِ من
ہمی خوں چکاں را بر چہرِ من
یکے شاد کن در نہانی مرا
بہ بخشاے روز جوانی مرا
فزوں زانکہ دادت جہاندار شاہ
بیارایمت تاج و تخت و کلاہ
وگر تو نیائی بفرمانِ من
بہ پیچی ز رای و ز فرمانِ من
کنم بر تو بر پادشاہی تباہ
شود تیرہ بر چشم تو ہور و ماہ
در رفتن سیاوش بارِ سوم پیش سودابہ - ص ۱۰۵ - ج ۱

من از پشتِ یعقوب پیغمبرم
پرستندۂ خالقِ اکبرم
سرائیل اللہ جز او کس نبود
زبانِ خرد ہوش او را ستود
چناں داں کہ یعقوب و اسحق را
کہ پیغمبر آں را ہمہ داد داد
ذبیح اللہ او بد ز پیغمبراں
پسندیدۂ داورِ داوراں
ہمیداں تو اسحق پاکیزہ رائے
ز پشتِ خلیلِ ستودہ خدائے
براہیم کش خواند یزداں خلیل ص ۱۵۵
فرستاد نزدش ہمی جبرئیل

نژادِ من از پشتِ گشتاسپ ست
کہ گشتاسپ خود پورِ لہراسپ ست
کہ لہراسپ بد پورِ اورند شاہ
کہ او را بدی آں زماں تخت و جاہ
ہم اورند از تخمۂ کے پشیں
کہ کردی پشیں بر پدر آفریں
پشیں بود از تخمۂ کیقباد
خردمند شاہی دلش پر ز داد
ہمی رو چنیں تا فریدوں شاہ
کہ اصلِ کیاں بود و زیبائے گاہ
ستایش کردن اسفندیار پہلوانے و نژاد خود را در پیش رستم ج ۳

میرا مضمون اپنے آخری مراحل تک پہنچ گیا ہے لیکن اس کو خاتمہ تک پہونچانے سے پیشتر چند کلمات دیباچۂ زلیخا کے بیانات کی نسبت جو اس مضمون کی ابتدا میں درج ہو چکے ہیں کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں واضح رہے کہ مقدمۂ یوسف زلیخا کے یہ بیانات موجودہ تحقیقات اور مشاہدات کی روشنی میں نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ان کو ایک نئی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ یہ نامعلوم مصنف جس کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ فردوسی کے عہد سے جدا کر رہا ہے اور جو فردوسی کے اصل واقعاتِ زندگی سے بھی زیادہ باخبر معلوم نہیں ہوتا کیوں چند سال اپنی زندگی کے صرف کر کے اس مثنوی کو فردوسی کے نام پر شائع کرتا اس کے پاس ایسی کون سی محرکات تھی۔

صحیح واقعات جو آٹھ صدیوں کی گہرائیوں میں مدفون ہیں آج کسی ممکن ذریعہ سے روشنی میں نہیں لائے جا سکتے۔ لیکن ہم اس سے واقف ہیں کہ انسانی طبیعت کی نوعیت کا معیار آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھا۔ قدامت پرستی میں جہاں اور محاسن ہیں وہاں ایک عیب بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنی مردہ پرستی کے جوش میں ان محترم اسلاف کو جن سے ہم کو اعتقاد ہے بعض اوقات ایسے پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں جس سے ان کو حقیقت میں کوئی سروکار نہ تھا مثلاً اسکندر فیلقوس کو اسلام میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ گویا وہ مسلمان تھا بعض نے اس کو ذوالقرنین تسلیم کیا ہے اور نظامی نے تو پیغمبر ان ہی لیا۔ اسی سلف پرستی کی ایک شان ہے جس نے ناصر خسرو کی مجعول سوانح عمری تالیف کروائی۔ کچھ اسی قسم کے اثرات میں تیمور مصنف بنا دیا گیا اس سے میرا مقصد توزک تیموری ہے یہ تالیف سب سے پیشتر جہانگیر کے عہد میں اشاعت پاتی ہے۔ اسی سلف پرستی کے طفیل زیب النسا بیگم کے نام اخلاف نے دیوان مخفی منسوب کر دیا۔ میری خیال میں اسی قسم کے محرکات نے فردوسی کے نام پر یہ کتاب مکمل کروائی۔

اسلامی حلقوں میں فردوسی غیر مقبول ضرور رہا ہے اس کے خلاف ناپسندیدگی کے اسباب زیادہ تر شاہنامہ کے اس حصہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ایران پر استیلائے عرب کا مذکور کرتا ہے۔ مصنف پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے عربوں کے ساتھ نہایت بے انصافی کی ہے۔ ان کی جس قدر کارنامے ہیں ان کا ذکر یا دانستہ چھوڑ دیا یا نہایت خفیف کر کے دکھایا ہے اس طرح نہ صرف وہ عربوں کے قومی وقار کو پامال کرنے کا

مجرم ہی بلکہ اسلامی جذبات کو بھی صدمہ پہونچاتا ہی۔ بعض اُصول کا جو اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اگر بے ادبی سے نہیں تو ادب سے بھی ذکر نہیں کرتا۔ مذہبی حلقوں میں بالخصوص اس پر بہت لعن وطعن ہوئی ہی اس کو رافضی معتزلی دہریہ اور مجوسی تک بنا دیا گیا ہی حتیٰ کہ گزشتہ صدی میں صاحب صولت فاروقی نے دل کھول کر مغلظات سنائی ہیں۔ اس سب دشنام کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ فردوسی کو ہمارے شیعہ بھائیوں نے اپنی طبقہ میں نہایت محترم جگہ دی اور قاضی نوراللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں پہلے کرسی ہمارے شاعر ہی کو دی

حقیقت یہ ہی کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی جس کی نازک اور کمزور بنیاد پر الزمات کے عالی شان قصر تعمیر کر لیئے گئے ہیں۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا اور ایرانِ مرحوم کی عظمت اور شکوہ کے افسانہ خوانی کر رہا تھا۔ کتاب جو اس کے پیش نظر تھی پہلوی تھی یا پہلوی ذرائع سے تدوین ہوئی تھی۔ جس کا تمام نقطۂ نظر ایرانی بلکہ یوں سمجھو ساسانی تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جب قومی فخر و مباہات کا صنم کدہ تعمیر ہو رہا ہی تو دوسرے قوموں کے کارناموں کی اِس میں گنجایش نہیں ہوتی جس حالت میں کہ رقابت کی آتش بھی زیر خاکستر ہو۔ فردوسی صنادید عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا ساسانی ایران اور کیانی ایران کے مرثیہ خوانی کر رہا تھا وہ تاریخ عرب نہیں لکھ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس معاملہ میں اس کی حیثیت ایک ترجمان سے زیادہ نہیں تھی جو واقعات اِس کو پہلوی ذرایع سے ملے وہی اِس نے نقل کر دیئے۔ اِن ذرائع میں جو زیادہ تر افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخی نقطۂ نظر سے چنداں وقیع بھی نہیں۔ اگر جذباتِ عرب کی آبگینہ پر سنگ اندازی کی گئی تو اُن کی ترجمانی میں فردوسی جس نے کہ ہم جان سکتے ہیں ان کی شدت کے معتدل کرنے میں ایک حد تک جدّوجہد بھی کی ہی عقلاً و انصافاً چنداں ملزم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بحیثیت مورّخ اس کا یہی فرض تھا کہ جو واقعات اس کی روایات نے اس تک پہونچائے ہیں ذکر کر دی۔ مثلاً ایک معاند اسلام رستم سپہ سالار یزدجرد نے جب کہ وہ قادسیہ کی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا اِسلام کے بڑھتے سیلاب کو دیکھ کر عربوں کے لیئے کہا۔ شعر

زیانِ کسان از پئی سودِ خویش بجویند و دیں اندر آرند پیش

(شاہنامہ، جلد چہارم ص ۱۲۱)

اور فردوسی نے اس قول کو نقل کر دیا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ فردوسی کیوں مستوجب تشنیع ٹھہرایا جائے لیکن

کچھ اسی قسم کے اسباب تھے جنھوں نے فردوسی کو بدنام کر دیا۔

آخر وہ زمانہ آیا جب کہ خدائے سخن کی حمایت میں ردِّ عمل شروع ہوا۔ ایک روز امام احمد الغزالی نے اثنائے وعظ میں بر سرِ منبر حاضرین کو خطاب کر کے کہا کہ :-

"اے مسلمانوں تم کو وعظ و موعظت کرتے مجکو چالیس سال گزر گئے ہیں اس چالیس سال کے عرصہ میں جو کچھ تم کو میں نے پند و نصیحت کی ہے فردوسی نے اس کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے اور وہ شعر یہ ہے ؎

زروزِ گزر کردن اندیشہ کن پرستیدنِ دادگر پیشہ کن (شاہنامہ ج ۱ ص ۱۲)

اگر اس پر عمل کرو تو پھر کسی وعظ و نصیحت کی تم کو ضرورت نہیں۔

(مرزبان نامہ۔ باب ۴۔ داستان سہ رہزن انباز بایکدگر ص ۷۶)

جب فردوسی کے اشعار منبر سے منقول ہونے لگے ہیں تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ غیر مذہبی حلقوں میں شاہنامہ ان ایّام میں بہت کچھ مقبول ہو چکا ہوگا۔ غالباً انہی ایام میں فردوسی کے معتقدین اور مداحین میں کوئی ایسا جوشیلا بھی نکل آیا جس نے مذہبی حلقوں میں عزیز بنانے کے خیال سے فردوسی کے نام پر یوسف و زلیخا تصنیف کی۔ اسلامی ادبیات میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ لوگ جب مذہبی امور میں تصرفات تحریفات اور موضوعات سے باز نہیں آئے تو یہ تو محض ایک ادبی معاملہ تھا اوروں نے قرآن مجید کے جواب لکھے ہیں حدیثیں موضوع کی ہیں اس لیے فردوسی کے لیے ایک مثنوی کا نظم کیا جانا کون سی بڑی بات تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور یہ کتاب شاہزادہ بایسنغر میرزا کے عہد تک جس کے حکم سے ۸۲۹ ہجری میں شاہنامہ پر ایک نیا دیباچہ لکھا گیا ہے معرضِ گمنامی میں رہی۔ سب سے پیشتر ہم اس دیباچہ میں مثنوی یوسف زلیخا کا ذکر پڑھتے ہیں کہ جب فردوسی بغداد میں پناہ گزیں ہوتا ہے تو خلیفہ اور اہلِ بغداد شاہنامہ بوجہ مدح ملوک عجم پسند نہیں کر سکتے تھے اس لیے اس نے ان کی خوشنودی کے خیال سے کتاب یوسف و زلیخا نظم کی یہ مثنوی بہت پسند کی گئی اور دربار میں اس سے فردوسی کی قدر و منزلت میں افزائش ہوئی۔ (شاہنامہ۔ دیباچۂ بایسنغر خانی ص ۱۳)

بغداد میں فردوسی کا قیام جس کو میں ایک غیر تاریخی واقعہ خیال کرتا ہوں ایک تاریخی قصہ کے انضمام سے پایۂ ثبوت کو پہونچایا گیا ہے۔ وہ قصہ دیباچۂ بایسنغر خانی میں یوں درج ہے کہ جب فردوسی کی رہائش کی اطلاع

سلطان محمود غزنوی کے گوش گزار ہوئی تو اُس نے فردوسی کی طلبی کی اُمید میں ایک مکتوب بارگاہِ خلافت میں روانہ کیا جس میں علاوہ اور شر رفشانیوں کے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر امیرالمومنین نے فردوسی کو میرے پاس واپس نہ کیا تو میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دونگا اور دارالخلافہ کی خاک ہاتھیوں پر بار کروا کر غزنیں لے آؤنگا۔ مستقل مزاج خلیفہ القادر باللہ سلطانی تہدید سے مطلق مرعوب نہ ہوا بلکہ اُس نے جواب میں صرف ایک لفظ "الم" لکھ بھیجا۔ محمود کے دبیر خلیفہ کے اس مختصر جواب کی عقدہ کشائی سے عاجز رہے انجام کار بڑے غور و خوض تلاش و تجسس کے بعد سب نے یہ رائے قائم کی کہ چونکہ سلطان نے اپنے خط میں خلیفہ کو خاک بغداد کی نسبت ہاتھیوں سے تہدید کی تھی۔ اس لئے جواب میں خلیفہ نے سورۃ الفیل کی طرف تلمیح کی ہے کہ "الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل"۔ سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا۔

میں اس واقعہ کی اصلیت پر کوئی اشتباہ پیدا کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ اس کا ذکر اکثر تاریخوں میں ملتا ہے اور سب سے پہلی تاریخ جس میں اس کا ذکر ہے اور میری نگاہ سے گزری ہے تاریخ گزیدہ ہے جو آٹھویں صدی کی ربع اول کی یادگار ہے تاریخ گزیدہ اور نگارستان میں بنائے مخاصمت سلطان اور خلیفہ کے مابین بالتصریح فردوسی بتایا گیا ہے لیکن ان تاریخوں کے باوجود وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ واقع میں فردوسی کا اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقیقت نفس لامر یہ ہے کہ امر متنازعہ فیہ سلطان اور خلیفہ کے درمیان ملک ماوراالنہر تھا۔ سلطان خواہشمند تھا کہ ملک ترکستان پر متصرف ہو اور خلیفہ مانع تھا۔ جب سلطان نے دیکھا کہ عجز و لجاج سے کاربر آری دشوار ہے تو ضرورتاً تشدّد کا لہجہ اختیار کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے وہ مشہور لفظ "الم" لکھا۔ میرے بیان کا سب سے قوی اور بہتر ثبوت کتاب قابوس نامہ ہے جو فارسی نثر میں پانچویں صدی ہجری کے ربع سوم کی ایک شاندار اور وقیع یادگار مانی جاسکتی ہے۔ اس کے مصنف امیر عنصر المعالی کیکاؤس والی طبرستان نے بعض تاریخی واقعے جو خود اُس کی سرگزشت یا اس کے قریب زمانوں کے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب میں درج کیے ہیں۔ ان ہی قصوں میں اتفاقیہ سلطان محمود اور خلیفہ القادر باللہ کا واقعہ بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں (باب سی و نہم در آئین کاتب ص ۱۰۵ و ص ۱۰۷) ہم صاف دیکھتے ہیں کہ سلطان اور خلیفہ کے مابین بنائے مخاصمت حقیقت میں ملک ماوراالنہر تھا نہ فردوسی۔ قابوس نامہ میں یہ تمام واقعات برخلاف دیباچہ بایسنغرخانی کے نہایت تفصیل

کے ساتھ درج ہیں۔ (تاریخ روضۃ الصفا میں ان ہی بیانات کی تائید کی گئی ہے)۔ قابوس نامہ سلطان محمود غزنوی کے صرف ترپّن[۵۳] سال بعد تصنیف ہوا ہے اور اِس واقعہ کے لیئے اس کتاب سے بہتر کوئی قدیم اور معتبر شہادت فی زمانناً دستیاب نہیں ہو سکتی باوجود ایسی مُعتبر شہادت کے اِس قصہ کا انضمام فردوسی کے نام کے ساتھ ان قرون کی فردوسی پرستی کے تصوّر سے سمجھ لیا جا سکتا ہے اور بس۔

کلام غالب (اُردو) کی شرحیں

(از جناب مولانا سید ہاشمی صاحب رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

تمہید

اُردو زبان میں صرف مرزا غالب کا کلام ایسا ہی جس کی گزشتہ چالیس برس میں کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور اس کی روز افزوں قبولیت یقین دلاتی ہی کہ آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہیگا اور اُمید رکھنی چاہیئے کہ ایک سے ایک بہتر و مُفصّل شرح لکھی جائے گی۔ اس رُجحان کو دیکھکر خاکسار کاتب الحروف کو موجودہ شرحوں پر یہ مضمون لکھنے کا خیال آیا۔

ان شرحوں میں سب سے مقبول اور عام پسند شرح تو مولانا حسرت (موہانی) کی ہی جو کئی بار طبع ہوکر ملک میں شائع ہوئی۔ لیکن سب سے مفصّل شرح نواب حیدر یار جنگ (مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی لکھنوی) کی ہی جو سنہ ۱۳۱۸ھ میں حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی تھی۔ اس شہر کے ایک اور فاضل مولوی عبد العلی صاحب والہ نے بھی ایک مختصر شرح تحریر فرمائی تھی اور اس اعتبار سے کہ وہ سب سے پہلی شرح ہی جو "وثوقِ صراحت" کے نام سے سنہ ۱۳۱۱ھ میں چھپی۔ تقدّم کی فضیلت اسی شرح کو حاصل ہی۔ ایک اور شرح حضرت شوکت (میرٹھی) "مجد والنسخہ متفرقہ" کے زورِ قلم کی یادگار ہی اور یہ سنہ ۱۳۱۱ء میں طبع ہوئی تھی۔

ان مستقل شرحوں کے ساتھ اس تبصرہ میں راقم الحروف نے یادگارِ غالب اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کے اُس مضمون کو بھی شامل کرلیا ہی جو رسالہ اُردو کے پہلے پرچے میں شایع ہُوا تھا۔ یہ دونوں مضمون پورے دیوان کی باقاعدہ شرح نہیں ہیں لیکن ان میں مرزا غالب کے بہت سے منتخب اشعار کے نکات و معانی کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہی اور حق یہ ہی کہ یادگارِ غالب ہی وہ کتاب ہی جس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں

کلام غالب کو مقبول و مُروّج کیا۔ ڈاکٹر بجنوری کے دلکش مضمون کو بھی اُس پیڑ کا پھل سمجھنا چاہیے جس کا بیج مولوی حالی مرحوم نے بویا تھا۔ میری نظر میں اس مضمون کی وقعت کا ایک خاص سبب یہ بھی ہی کہ اسے دیکھکر ہم اس بات کا بہت عمدہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ گزشتہ چالیس[1] برس میں زبانِ اُردو کی ترقی اور مغربی علوم و خیالات کی اشاعت نے کلامِ غالب کی قبولیت پر کیا عجیب اثر ڈالا ہی اور آج زبانِ اُردو کے بہترین ادیب غالب کی شاعری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ کم سے کم اپنے اُردو کلام کے متعلق تو مرزا صاحب مرحوم کی اس حسرتناک پیشین گوئی کے پورے ہونے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں ہی کہ

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن!

(۱) یادگارِ غالب

اگر کلام کی خصوصیات کو ناظرین کے ذہن نشین کرنا، شرح کے مقاصد میں داخل ہی تو اس کام کو مولوی حالی صاحب مرحوم سے بہتر کسی شارح نے انجام نہیں دیا۔ انھوں نے مرزا غالب کی بلند خیالی اور جدّت پسندی پر ایک دلچسپ بحث کرنے کے بعد اُن کے اُردو کلام کی چند خصوصیتیں بیان کی ہیں اور تمثیل میں منتخب اشعار فراہم کئے ہیں۔ اور ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان خصوصیات اور ان کی ذیل کے بعض اشعار کو معہ شرح خود مولوی صاحب مرحوم کے الفاظ میں نقل کریں:۔

(۱) علاوہ جدّتِ مضامین اور طرفگیِ خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذونادر پائی جاتی ہیں۔ اوّلاً عام اور مبتذل ... تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں ... مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہی چراغِ رہگذارِ بادِ یاں

---

[1] یادگارِ غالب کی طبع دوم کا جو نسخہ علی گڑھ میں چھپا اور راقم کے پیش نظر ہی اس سے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کب چھپی تھی۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہی یادگارِ غالب پہلی مرتبہ ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء یعنی ۱۳۱۴ یا ۱۳۱۵ھ میں شائع ہوئی ہی۔

یہاں سُورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہی اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال وفنا ہیں، چراغِ رہگذارِ باد سے تشبیہہ دی ہی جو بالکل نئی تشبیہہ ہی۔

دوسری جگہ سُورج کو اس لحاظ سے کہ حُسنِ معشوق کے مقابلہ میں اُس کو ناقص الخلقۃ قرار دیا ہی ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہہ دی ہی چنانچہ کہتے ہیں ؂

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہُوا تھا!

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہی کہ مرزا نے استعارہ وکنایہ وتمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے اور جس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجّہ کی ہی، ریختہ میں بھی نسبتہً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ ۔ ۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں ؂

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اِس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلّی ہو سکتی ہی اس طرح ادا کیا ہی کہ ع

بجلی اک کوند گئی ــــــ الخ

دوسری مثال ؂

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہی: اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہی اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں۔ جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہی ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہی جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔

(۳) تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں کیا نظم میں اور کیا نثر میں باوجود سنجیدگی ومتانت کے شوخی اور ظرافت ہی جیسا کہ انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔

(۴) چوتھی خصوصیت مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہی جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں ما بہ الامتیاز کہا جا سکتا ہی (یعنی) اُن کے اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہی کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد اُس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں :-

(پہلی مثال) ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہی کہ اس کو دیکھکر گھر یاد آتا ہی یعنی خوف معلوم ہوتا ہی - مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سبھجتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہو گی مگر دشت بھی اس قدر ویراں ہی کہ اس کو دیکھکر گھر کی ویرانی یاد آتی ہی -

(دوسری مثال) ؎

کون ہوتا ہی حریفِ مئے مرد افگنِ عشق　　　ہی مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مئے مرد افگنِ عشق کا ساقی، یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہی یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہی - مطلب یہ کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اُس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے - مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس شعر میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں وہ یہ کہ پہلا مصرع ساقی ۔ ۔ ۔ ایک دفعہ تو بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہی "کون ہوتا ہی حریفِ مئے مرد افگنِ عشق" یعنی کوئی ہی جو مئے عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پہ کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہی کہ "کون ہوتا ہی حریفِ مئے مرد افگنِ عشق" ! یعنی کوئی نہیں ہوتا "

اسی قسم کے ذو معنی اشعار کی چند اور مثالیں تحریر کرنے کے بعد مولوی حالی صاحب لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابل ذکر ہی جو مرزا اور اُن کے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً

پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اُنھی مضامین اور خیالات کو جنھیں پہلے شعرا آسان و سلیس پیرایے اور سادہ الفاظ میں لکھ گئے ہیں، مرزا نے نہایت ندرت اور عجیب عجیب نزاکتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً ؎

(۱) ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں　　رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

(۲) غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ۔ دیکھو جرم کس کا ہے　　نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

(۳) کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں　　آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

(۴) ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں　　بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

(۵) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اُسے دیکھوں؟ بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے!

"پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑجانا، دوسرے میں عاشق کے جذبے اور معشوق کی کشیدگی سے کشش کا لازم آنا، تیسرے میں نکہتِ گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولے سے سینکڑوں وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا۔ . . . یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لے کر میر سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں اور اگر تھیں تو صرف اس قدر جیسے آٹے میں نمک۔"

اس کے بعد مولوی حالی صاحب مرحوم نے مرزا کی غزلیات میں سے دو سو سے زیادہ اشعار منتخب کئے ہیں اور اُن کی حسب ضرورت شرح اور محاسن کو نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ اس شرح کے بھی چند نمونے نقل کرنے کے لائق ہیں:- ؎

(۱) ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

مولوی حالی صاحب شرح میں لکھتے ہیں کہ اس میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُس وقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگ گراں سدِ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سُبک دستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔"

(۲) فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا　　کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

کہتا ہے کہ (کل) تمہارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی۔ اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانۂ حال ہو جائیں گے۔

پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت گزر جانے کے دو نوں معنی ہیں: نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آجانا۔"

(۳) رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا = بیشرم و بیباک ہونا۔ پاک = آزاد یا شہدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بیشرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھُل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ "رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے" بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔"

(۴) اے پرتوِ خورشید جہانتاب، ادھر بھی سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

مولوی حالی صاحب نے اس شعر کے جو معنی بیان کئے ہیں ان کی طرف کسی شارح کا خیال نہیں گیا اور نہ عام طور پر جاتا ہے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر میں آفتاب حقیقت کی طرف خطاب ہے" کہتا ہے کہ جیسے سایہ متہم بوجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں (کہ ہمارا کوئی مستقل وجود ہے۔ پس) اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ افگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنافی الشمس ہو جائیں۔ کیوں کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔"

(۵) توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

"دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اُس کی تائیدِ غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو ... اُس کو یہ درجہ (آنکھوں میں جگہ ملنے کا) حاصل نہ ہوتا۔"

(۶) رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

"کہتے ہیں کہ دُنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا جو دُنیا کو محض ناچیز سمجھکر اسی کی طرف التفات نہ کرتے تو دُنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح

میخانے میں جام وسبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہی کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہی اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہی کہ اس میں اہلِ ہمّت معدوم ہیں"

بعض اشعار کی جو شرح مولوی حالی صاحب نے تحریر فرمائی ہی اس میں اختلاف وگفتگو کی گنجائش نظر آتی ہی۔ مثلاً ؎

رونقِ ہستی ہی عشقِ خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہی گر برق خرمن میں نہیں

اس شعر کے مولوی صاحب نے یہ معنی تحریر کیے ہیں کہ "تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہی وہ عشق و محبت کی بدولت ہی۔ ۔ ۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہی جس میں شمع کی روشنی نہیں" راقم الحروف کے نزدیک ان معنی میں سب سے اہم پہلو بیان ہونے سے رہ گیا۔ درحقیقت مرزا غالب نے یہاں فلسفۂ رواقیہ کا یہ عقیدہ بیان کیا ہی کہ خود ہستی کا مقتضیٰ اور لازمہ فنا یا نیستی ہی اس مضمون کو مرزا صاحب نے اور بھی کئی جگہ ادا کیا ہی مثلاً اس مشہور شعر میں: ع

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی الخ

مذکورۂ بالا شعر میں بھی اس مضمون کو ایک نئے پیرائے میں ادا کیا ہی اور فنا کی بجائے "عشقِ خانہ ویراں ساز" لاکر اُسے بہ اعتبارِ تغزّل نہایت دلکش و واضح ترقی دی ہی ورنہ مطلب صرف یہ ہی کہ ہستی اُسی وقت ہستی کہلانے کی مستحق ہوتی ہی جب کہ خود اُس کے اندر نیستی کی اہلیت اور استعداد موجود ہو!

اس غزل کا مقطع ہی کہ ؎

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

مولوی حالی صاحب اس شعر کے یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ "اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہی یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہی تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اُس کی کچھ قدر نہیں ہوتی یہی حال میرا ہی کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں" لیکن راقم الحروف کو ان معنی میں کلام ہی۔ شاعر کا اصلی مطلب یہ معلوم ہوتا ہی کہ دیس اور پردیس کہیں بھی میرے مخفی جوہر ظاہر نہو سکے اور دونوں جگہ میں ایسا ہی ناکارہ سمجھا گیا جیسا گھانس پھونس کا ایک ڈھیر جو بھٹی میں نہ ڈالا جائے تو محض کوڑا

اور بادی النظر میں بالکل بیکار و بے حقیقت شے ہی حالاں کہ اگر وہ اپنے موزوں مقام یعنی گلخن میں ہوتا تو اس کے کمالات ظاہر ہوتے اور وہ روشن و منور ہو جاتا۔ خس اور گلخن کے اس نادر مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور شعر میں اس طرح تحریر کیا ہی۔ ؎

فنا کو سونپ گر مشتاق ہی اپنی حقیقت کا فروغ طالع خاشاک ہی موقوف گلخن پر!

اسی طرح ممکن ہی کہ اور بھی ایک دو مقامات پر مولوی حالی صاحب کے بیان کردہ معنی قابل تسلیم سمجھے جائیں۔ لیکن مجموعی طور پر جس خوبی سے انھوں نے اشعار کی شرح کی ہی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ خاص کر فارسی اشعار کے محاسن و معانی بیان کرنے میں مولوی صاحب مرحوم نے سخن سنجی اور انشا پردازی کا حق ادا کر دیا ہی اور اسے دیکھکر خواہ مخواہ دل چاہتا ہی کہ مرزا غالب کے پورے اُردو دیوان کی شرح بھی اسی دلنشین پیرائے میں لکھی جائے۔ کیوں کہ یادگارِ غالب میں اوّل تو سارے کلام کی شرح نہیں ہی دوسرے انتخاب میں بھی اکثر وہی اشعار چھوڑ دیئے گئے ہیں جو زیادہ پیچیدہ و ادق اور اس لئے زیادہ شرح طلب تھے۔ بات یہ ہی کہ مرزا غالب کے شاگرد اور مداح ہونے کے باوجود مولوی حالی صاحب مرحوم اُس رائے کے اثر سے محفوظ نہ تھے جو مرزا کے اُردو کلام کے متعلق ان کے اکثر ہمعصروں نے قایم کر رکھی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ رائے کسی محکم و واضح اصول پر مبنی نہ تھی اور گو اس پر مفصل بحث کرنے کا یہ محل نہیں تاہم اجمالاً اس قدر عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہی کہ مرزا غالب کے زمانہ میں شاعری محض تفنن سمجھی جانے لگی تھی دوسرے اُردو کلام کو بھی لوگ شعرِ فارسی کی سلاست و شگفتگی کے معیار پر جانچتے تھے اور اس لئے مرزا کا وہ سنجیدہ اور ادق کلام جس میں نہایت بلند و عمیق فلسفیانہ خیالات کی تعلیم تھی اُس زمانہ میں مقبول نہ ہو سکتا تھا چنانچہ خود اُن کے قدردان دوستوں نے صدہا شعر دیوان اُردو میں سے خارج کر دئیے[1] اور پھر بھی مولوی حالی صاحب لکھتے ہیں کہ اس "انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظر میں کرنے کے قابل تھے

---

[1] اسے تائید غیبی سمجھنا چاہئے کہ اب جب اس کی قدردانی کا وقت آیا تو وہ متاعِ گم گشتہ بھی دستیاب ہوگئی یعنی مرزا غالب کا وہ اُردو کلام جسے اپنے دستوں کے مشورے سے انھوں نے تلف کر دیا تھا محض حسنِ اتفاق سے ایک جگہ محفوظ رہ گیا اور حال میں ریاست بھوپال کی امانت سے طبع ہُوا ہی۔

اُن کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔"

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہی۔ کچھ تو فارسی کی شاعری سے ناواقفیت اور زیادہ تر زبان اُردو کی روز افزوں وسعت و ترقی، عام تعلیم اور لوگوں میں غور و فکر کا شوق بڑھنے کے باعث مرزا غالب کے ادق مگر حکیمانہ کلام کی وقعت و قبولیت برابر بڑھتی جاتی ہی اور آیندہ یقین ہی کہ اور زیادہ بڑھیگی۔ دوسرے آج کل جب کہ نثر اُردو میں (بلا "ضرورتِ شعر" بھی) بعض صاحبوں کو نئے نئے الفاظ وضع کرنے کی دُھن لگی ہوئی ہے اور کہیں نامانوس و ثقیل عربی یا سنسکرت الفاظ کی افراط ہی اور کہیں ایسے مرکبات کی بھرمار کہ جن کو بلا لحاظِ اصول و موزونیت، عربی کا ہندی سے اور فارسی کا انگریزی سے پیوند لگا کر بنایا گیا ہی، کوئی وجہ نہیں کہ مرزا غالب کے اُن شاعرانہ مرکبات کو دیکھکر ناک بھوں چڑھائی جائے جو اگرچہ نئے اور عسیر الفہم ہیں لیکن زبان کے مسلمہ اُصول کے مطابق اور نہایت لطیف و نادر مطالب پر مشتمل ہیں اور ان کی تہ میں خیالاتِ عالیہ اور جذباتِ صادقہ کا ایک عجیب عالم نظر آتا ہی جیسا کہ خود فرماتے ہیں:۔ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے ۔۔۔ جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے!

(۲) وثوقِ صراحت

جیسا کہ اوپر بیان ہُوا دیوان غالب کی یہ اُردو شرح ایک دکنی فاضل مولوی عبد العلی صاحب والہ مرحوم نے تحریر فرمائی ہی جو نظام کالج حیدرآباد میں پروفیسر تھے۔ اس کالج کا تعلیمی تعلق مدراس یونیورسٹی سے ہی اور اس یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعتوں میں اُردو زبان بطور ایک اختیاری مضمون داخلِ درس ہی اور بی اے کے اُردو نصاب میں دیوانِ غالب بھی پڑھایا جاتا تھا۔ نظام کالج میں یہ خدمت مولوی عبد العلی صاحب کے سُپرد تھی اور اسی کی انجام دہی کے ضمن میں انھیں دیوان غالب کی ایک مستقل اور باقاعدہ شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ شرح ۱۳۱۱ھ میں تکمیل کو پہنچ گئی اور "وثوق صراحت" اس کا تاریخی نام ہی۔ مگر شائع کرنے سے قبل شارح مرحوم اس پر نظرِ ثانی کرنی چاہتے تھے کہ وفات پائی اور کتاب ان کے انتقال کے ڈیڑھ دہ سال بعد مرحوم کے فرزند مولوی عبد الواجد صاحب کے اہتمام سے طبع ہوئی۔

لیکن اس شرح میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ غالباً عام طلبہ اُس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے البتہ ممکن ہے کہ اساتذہ کو حضرت والا کے "اشارات" سے اشعار کے معنی سمجھانے میں مدد ملے۔ مثلاً مرزا صاحب کے مطلع دیوان ہی کے معنی میں شرح کرنے والوں نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ صاحب وثوق صراحت اس کی شرح اس طرح کرتے ہیں:- ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

"پیرہن کاغذی = فریادیوں کا لباس جو قدیم میں دستور تھا۔ یہ کنایہ ہے عجز و بیچارگی و تظلّم و زاری سے" (انتہیٰ کلامہ)

یا اس شعر کی شرح میں کہ "مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت الخ" صرف ایک لفظ "ہیولیٰ = مادہ" لکھنا کافی سمجھتے ہیں۔

بعض جگہ شعر کے الفاظ کے نیچے صرف ہندسے لکھ کر اُن کے مشبّہ اور مشبّہ بہ ہونے کا تعلق ظاہر کر دیا ہے اور کوئی شرح نہیں کی۔ مثلاً ؎

"بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا"

اکثر مقامات پر جہاں زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے وہاں خود شرح کی عبارت بہت اُلجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً ؎

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "رہ گزر مذکور میں جو پیشتر نزاکتِ موفور کے سبب جلوۂ گل باعثِ گردِ کدورت تھا، اب عاشقی میں اس دل و جگر کا یہ حال ہے۔" پھر اُستاد فصیحی کا یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

"پامالِ دو صد قافلہ خوں ست دریں راہ آں دیدہ کہ از سایۂ مژگاں گلہ دارد"

لیکن وثوق صراحت پر ہم زیادہ تفصیل سے تنقید کرنی نہیں چاہتے۔ یہ ایک غیر معروف سی کتاب ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے کلام غالب کے شایقین یا طلبہ کا کوئی گروہ اس شرح کو مستند نہیں سمجھتا نہ اس کے آیندہ کسی خاص شہرت و قبولیت پانے کی توقع ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہم یہاں دیوان غالب کی دو چھوٹی چھوٹی

غزلیں اور ان کے اشعار کی جو شرح وثوقِ صراحت میں لکھی ہے اسے بعینہٖ نقل کر دینے پر اکتفا کریں تاکہ خود ناظرین کو اس شرح کے محاسن و اسقام کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے :-

اشعار غالب	شرح (وثوقِ صراحت صفحہ ۶۱،۶۰)
(۱) مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں	"چکر = ایہام بمعنی گردش نہ حلقۂ زنجیر"
(۲) شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں	"دشت = دشت بے کنار و سرو رگم (؟) جادہ غیر از ـــ الخ = جادہ معدوم و ناپیدا ہے جیسے نگاہِ دیدۂ تصویر میں"
(۳) حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں	"رہی جاتی ہے اگر اس جادہ پر سلوک نہ کریں"
(۴) رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں	"زبونی کش = عاجزی اُٹھانے والا"
(۵) سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں	"سر کھجاتا ہے = ایہام۔ پھر زخم سنگ کھانے کے لئے اور خراش میں جو ایک مزہ ہوتا ہے معلوم ہے۔ سنگ = سنگِ طفلاں جس کی ماریں جراحت و التیام دونوں کا اثر ہے۔ سر کھجانا = کنایہ ہے دوبارہ مار کھانے کی خواہش پیدا ہونے سے۔ نظیر اس کی سر توقع خاریدن یعنی متوقع شدن"
(۶) جب کرم رخصتِ گستاخی و بیباکی دے کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں	"کرم = کرم محبوب۔ کوئی تقصیر ـــ الخ بیباکی تقصیر سے شرمندہ ہونا ہی بڑی تقصیر ہے"
دوسری غزل	(وثوق صراحت صفحہ ۱۳۵)
(۱) نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے	"نقشِ ناز، صنم طناز کا رقیب کی آغوش میں ایسا بدنشین و بدنما ہے کہ اس کی تصویر کھینچنے کو پائے زشتِ طاؤس واسطے خامۂ مانی

دوسری غزل

(۲) تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
(۳) وہ تپِ عشق تمنّا ہی کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

(وثوقِ صراحت صفحہ ۱۳۵)
(مصوّرِ چین) کے چاہیئے کیوں کہ نگارِ طنّاز بمثابہ نقش بال طاؤس اور آغوشِ رقیب بمنزلۂ بالِ طاؤس ہی۔ لہٰذا پائی طاؤس کا خامۂ نقاشی نقش مذکور کے لئے ضرور ہُوا۔ واللہ اعلم "
"تحیّر کو = حیرانیِ عاشق کو جس کا لازم سکوت ہی۔ غم = غم عشق آشفتہ بیانی مانگے = پریشان گفتاری چاہی جو ضدِ حیرانی ہی "
"وہ تمنّا ہی = مجھے آرزو ہی۔ شعلہ = تپ مذکور کا شعلہ نبضِ جگر = نبضِ جگرِ شمع۔ کنایہ ہی رشتۂ شمع سے جس میں ریشہ دوانی شعلے کی روش ہی "

(۳) شرح مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی

(المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ)

یہ دیوانِ غالب کی سب سے مفصّل اور کئی لحاظ سے باوقعت شرح ہی۔ مولوی علی حیدر صاحب جنھیں ہم اُن کے ریاست حیدر آباد کے خطاب کے مطابق "نواب صاحب" لکھیں گے، زبان اُردو کے مشہور و معروف ادیب ہیں۔ اکثر اہلِ لکھنؤ انھیں فنِ شعر کا مُسلّم الثبوت اُستاد جانتے اور اُن کی آرا کو قابلِ استناد مانتے ہیں اُن کی تصانیف میں دیوانِ غالب کی یہ شرح غالباً سب سے بڑی اور مشہور کتاب ہی اور مولانا حسرت موہانی صاحب نے بھی اپنی شرح کے آخری حصّے کے لکھنے میں اس کتاب سے ایک حد تک مدد لی تھی۔ انھی وجوہ سے راقم الحروف نے اس شرح کا بہت غور سے مطالعہ کیا اور چاہتا ہی کہ اس کے متعلق اپنی بُری بھلی رائے کو وضاحت سے تحریر کرے۔

شروع ہی میں یہ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس شرح کے متعلق لوگوں کو عام طور پر دو شکایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ شرح کی عبارتیں زیادہ صاف اور سلیس نہیں اور بعض جگہ خود شارح کا مفہوم سمجھنا دشوار

ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مجھ سے ایک صاحب کہتے تھے کہ حضرتِ طباطبائی نے دیوان غالب کی جو شرح لکھی ہے خود اس کا مطلب سمجھنے کے لئے ایک اور شرح ہونی چاہیئے! مگر ہمارے خیال میں یہ اعتراض چنداں وقیع نہیں اور نواب صاحب کی طرف سے اس کا یہ مختصر جواب کافی ہوگا کہ انھوں نے جو شرح لکھی ہے وہ مبتدی طلبہ کے واسطے نہیں ہے۔

دوسری شکایت جس کا ہم نے اکثر اربابِ ذوق میں چرچا سنا یہ ہے کہ نواب صاحب نے غالبؔ کے اشعار پر جا و بیجا بہت سے اعتراض کئے ہیں اور انھیں دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ شرح لکھنے سے شاید نواب صاحب کا ایک مقصد یہ تھا کہ مرزا صاحب کی شاعری کو بدنام کیا جائے اور اُن کے کمالات پر خاک ڈالی جائے۔ لیکن ہماری دانست میں نواب صاحب کی نسبت اس قدر بدگمانی بھی مناسب نہیں ہے۔ بے شبہ انھوں نے مرزا صاحب کے اشعار پر بہت سے اعتراض کئے ہیں مگر اسی کے ساتھ جا بجا دل کھول کے تعریف بھی کی ہے اور پوری شرح کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر نواب حیدر یار جنگ صاحب مرزا غالب کی اُستادی کے معترف ہیں۔

اس شرح کے متعلق ایک اور بات بھی بیان کرنی ضروری ہے وہ یہ کہ اگرچہ یہ ہر اعتبار سے دیوان غالب کی مکمل شرح ہے اور بعض دیگر شارحین کی طرح اس میں کسی دشوار و حل طلب شعر کو تا امکان شرح کئے بغیر چھوڑا نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شرح میں جا بجا غیر متعلق مباحث نظر آتے ہیں جو بجائے خود کیسے ہی دلچسپ اور پُرمغز کیوں نہ ہوں اس کتاب کے موضوع سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ مثلاً صفحہ ۳۹، ۴۹ پر میرؔ و سوداؔ کی بعض غلطیاں دکھائی ہیں۔ صفحہ ۸۵ پر دہلیؔ و لکھنؤؔ کی زبان پر محاکمہ فرمایا ہے اور زبانِ دہلی کی خرابیاں اور زبانِ لکھنؤ کی وجوہ ترجیح بیان کی ہیں اور صفحہ ۷۷ پر حضرت علیؓ کے وصی رسولؐ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونے کی دلیلیں تحریر فرمائی ہیں! اسی طرح متعدد مقامات پر صفحے کے صفحے اُن مضامین سے بھرے ہوئے ہیں جن کا شعر کی شرح سے براہ راست کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ راقم الحروف کی رائے میں اگر اس شرحؔ کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئے تو جناب نواب صاحب کو چاہیئے کہ اس قسم کے تمام مباحث کو خارج کر دیں۔ بالخصوص ایک دیوان کی شرح میں مذہبی مناظرے کے مضامین کا شامل رہنا ہرگز جائز نہ رکھیں کہ یہ سراسر بے محل اور ناپسندیدہ بات ہے۔

نمونہ شرح

اب ہم نواب صاحب کی شرح کے چند عام نمونے نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اُن کے اعتراضات پر ایک نظر ڈالیں گے۔

(۱) مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

"یعنی میں وہ دہقاں ہوں جس کی سرگرمی خود اسی کے خرمن کے لئے برق کا کام کرتی ہے۔ یعنی خرمن کو جلائے ڈالتی ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حرارتِ غریزی جو کہ باعثِ حیات ہے خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے۔ ہیولیٰ بمعنی مادہ۔ اور مصنف نے صورت کی لفظ ہیولیٰ کی مناسبت سے استعمال کی ہے اور تعمیر سے تعمیرِ جسمِ خاکی مقصود ہے۔ خونِ گرم، بمعنی سرگرمی۔ اس شعر میں جو مسئلہ طب مصنف نے نظم کیا ہے اسے آگے بھی کئی جگہ باندھا ہے۔"

(۲) یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

"تو اور پاسخ مکتوب) یعنی تو اور جواب لکھے، ممکن نہیں۔ تقدیر اس کی یہ ہے (کہاں تو اور کہاں پاسخِ مکتوب) کہاں کی لفظ محذوف ہے اور لفظِ پاسخ سے نوشتنِ پاسخ یا فرستادن و دادن پاسخ مراد ہے اور قاعدہ یہ ہے (کہ) کبھی فعل و فاعل میں اظہارِ استبعاد کے لئے حرفِ عطف کو فاصل کیا کرتے ہیں مثلاً آگ اور نہ جلائے۔ یعنی یہ بات مستبعد ہے۔ اور کبھی مبالغے کے لئے عطف کرتے ہیں جیسے آگ اور دہکتی ہوئی۔ اسی طرح اور متعلقاتِ فعل میں بھی فصل کر دیتے ہیں۔"

(۳) دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

"کہتے ہیں جسے ہم سانس سمجھے ہوئے تھے وہ ایک موجۂ خوں کی پرافشانی ہے یعنی غم نے دل و جگر کو لہو کر دیا ہے۔ طبیب کہیں گے کہ جگر میں سانس کہاں جاتی ہے دل و ریہ کہا ہوتا اور ریہ کو فارسی میں شش اور اردو میں پھیپھڑا کہتے ہیں لیکن یہ تینوں لفظ کسی شاعر نے نہیں باندھے کہ غیر فصیح ہیں۔ یہ عجب سوء اتفاق ہے

ﮯ یہ لفظ (نیز آگے سانس کو) راقم الحروف نے بجنسہ مؤنث نقل کر دیا ہے ورنہ اہلِ دہلی مذکر بولتے ہیں اور نواب صاحب نے بھی اسی شرح میں ایک مقام پر اسے مذکر لکھا ہے۔

کہ اُردو کا لفظ جب غیر فصیح معلوم ہوتا ہے تو شاعر فارسی یا عربی کا لفظ لے لیتا ہے۔ یہاں عربی و فارسی میں یہی لفظ شُش ورِیہ لینے کے قابل نہیں۔۔۔۔ اسی طرح دیکھو ؏

یہ پھیپھڑے ہیں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے

شاعر کی زبان نہیں معلوم ہوتی ہے یہی اشکال واقع ہونے کے سبب سے مصنّف نے پھیپھڑے کا نام بھی جگر رکھ لیا کہ محض اندرون شے کو بھی جگر کہتے ہیں۔"

(۴) بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

(کا) کے یہ معنی ہیں کہ کس کی چشمِ مست نے بزمِ مے کو وحشت کدہ بنا دیا ہے، اور موجِ شراب کو نبضِ پری سے تشبیہ دی ہے تاکہ مطلب یہ نکلے کہ پری بزم سے وحشت کرکے نکل گئی۔"

(۵) ہجومِ نالہ، حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

مُیدانِ جنگ میں جب کوئی گروہ مغلوب ہو جاتا ہے تو اپنا اظہارِ عجز کرنے کے لئے گھانس پھونس وغیرہ مُنہ میں دبا کر دکھاتے ہیں کہ لڑائی موقوف کرو۔ یہاں ہجومِ نالہ نے لشکر کشی ہے اور حیرت ایک نالہ کرنے میں بھی عاجز ہے اور اسی عجز کا اظہار کرنے کے لئے خموشی ریشۂ صد نیستاں سے ــــ الخ لیکن خس بدنداں ہونے کے لئے ریشۂ نیستاں کی کیا تخصیص ہے؟ یہ کہ وہ نالہ و فریاد کی جڑ ہے کہ ریشہ سے نَے پیدا ہوتی ہے اور نَے سے نالہ۔ اور حالتِ ضبط میں نالے چھُپے ہوئے ہیں جس طرح ریشۂ نیستاں میں۔۔۔ حرفِ ندا محذوف ہے یعنی "اے ہجومِ نالہ" مُراد ہے۔ فقط ہجومِ نالہ کو مخاطب کرکے مصنّف نے ریشۂ صد نیستاں کہنے کا باعث بنا دیا۔"

تحسین و اصلاح

شرح کا اصلی مقصود تو یہ ہے کہ مشکل اور حل طلب مقامات کے صاف اور سادہ الفاظ میں معنی بیان کر دیئے جائیں۔ اسی کے ساتھ شعر کے خاص خاص محاسن واسقام کی طرف اشارہ کرنا بھی شارح کے فرائض میں داخل کر سکتے ہیں لیکن اس بارے میں جہاں تک ہو سکے اختصار و احتیاط سے کام لینا چاہیئے خاص کر عیوب کے بیان کرنے میں مسلّمہ اصول و قواعد کی پابندی ضروری ہے۔ محض انفرادی ذوق اور ذاتی رائے کی بنا پر کسی شعر کی

بے تامل مذمت نہ کرنی چاہیے کیوں کہ شاعری ذوقی چیز ہے اور بہت ممکن ہی کہ ایک شعر ہمیں اچھا نہ معلوم ہو مگر دوسرا شخص اس کو سُن کر پھڑک جائے، تنقید اور تبصرے کا معاملہ دوسرا ہی اور ان کے لکھنے سے نقاد کی غرض ہی یہ ہوتی ہی کہ جو رائیں اُس نے قایم کی ہیں ان کو مُدلّل اور واضح طریق پر ناظرین کے سامنے پیش کرے کہ وہ ان آرا میں اُس کے شریک اور ہمخیال ہو جائیں۔

شرح نویسی کی اِس حد بندی کو اگر ہمارے خیال کے موافق درست مانا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ نواب حیدر یار جنگ نے اپنی شرح دیوان غالب میں کافی احتیاط سے کام نہیں لیا۔ ہم نے سرسری طور پر گن کر دیکھا تو کم و بیش ایک ہزار اشعار کی شرح لکھنے میں نواب صاحب موصوف نے چالیس پچاس جگہ تو شعر کی تعریف کی ہی لیکن تقریباً سوا سو مقامات پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کئے ہیں اور جا بجا خود اصلاح دے کر گویا کلام غالب کی خامی ظاہر کی ہی۔ پہلے انھیں مجوزہ اصلاحات کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ ؎

(۱) ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

اس شعر کے معنی اور تشبیہہ کی خوبی بیان کرنے کے بعد نواب صاحب لکھتے ہیں "مگر شعر میں یہ کہنا کہ ایسا ہو اور ویسا ہو شعر کو سُست کر دیتا ہی۔ اس کے برخلاف اگر یوں کہتے کہ تیری صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے" تو زیادہ لطف دیتا" (صفحہ ۱۵)

لیکن اِس "اصول" کی عجیب ہمہ گیری سے قطع نظر حیرت ہی کہ نواب صاحب کو پہلے مصرعے کا خیال نہ رہا کہ اگر اُن کے خیال کے مطابق دوسرے مصرعے کو بدلا جائے تو پہلے کا کیا حشر ہوگا؟

(۲) جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "جلاد و واعظ میں چنداں مناسبت نہیں اگر واعظ کی جگہ قاضی کہتے تو اچھا تھا کہ وہی انا الحق کہنے والوں کے قتل کا فتویٰ دیا کرتا ہی"

نواب حیدر یار جنگ صاحب جیسے باریک بیں نقاد کا یہ قول دیکھکر ہمیں واقعی تعجب ہوا۔ کیوں کہ ہندوستان کا تو ذکر کیا ہی جہاں صدیوں سے قاضی صرف نکاح خوانی کی خدمت انجام دیتا ہی خود فارسی شعرا کے ہاں بھی غزل میں اس لفظ کا استعمال شاید مشکل سے کہیں ملے گا۔

(۳) اہلِ ہَوس کی فتح ہی ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

اس شعر کی شرح کرنے کے بعد نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "اس مضمون کو یوں کہنا تھا۔ ع

اُٹھا وفا سے ہاتھ تو اونچے علم ہوئے" (صفحہ ۱۸۶)

افسوس ہی کہ راقم الحروف نواب صاحب کے اس مصرعے کا مطلب ہی نہ پاسکا۔ یہ تو معلوم ہی کہ اس میں علم اُٹھنے اور اونچے ہونے کا ضلع باندھا گیا ہی لیکن باوجود کوشش کے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مصرعے کو اختیار کرنے کے بعد شعر کا یا خود اس مصرعے کا مفہوم کیا ہوگا؟

اسی غزل کا ایک اور شعر ہی۔ ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

نواب صاحب نے ایک طویل بحث کے دَوران میں اس شعر کے پہلے مصرعے کے بجائے خود سترہ مصرعے تضمین کیے ہیں (صفحہ ۱۸۳) جن میں سے دو پہلے اور دو آخری (جو غالباً اوروں سے بہتر ہیں) یہ ہیں

چھوڑا نہ درکو یار کے کیا کیا ستم ہوئے — ہر چند اس میں ہاتھ ــــــ الخ

پردہ اُٹھا کے ہم نے تمھیں دیکھ تو لیا — " " "

چوری سے بوسۂ خطِ رُخسار لے لیا — " " "

کھانے دیا نہ ہم نے کسی نخل کو تبر — " " "

راقم الحروف نے بعض اور صاحبانِ ذوق کو بھی نواب صاحب کے یہ سب مصرعے سُنائے لیکن افسوس ہی ان سترہ مصرعوں میں سے ایک کو بھی کسی صاحب نے مرزا غالب کے اصلی مصرعے سے بہتر و قابل ترجیح نہیں بتایا۔

مرزا غالب کا کلام آسمانی یا الہامی تو ہی نہیں کہ اس میں لغزش و خطا کا احتمال ہی نہ ہو۔ لیکن اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ مرزا غالب کو شاعری سے غیر معمولی اور خداداد مناسبت تھی اور ابتدائی تعلیم و تربیت بھی ایسی ملی جو مشرقی شاعری کے حق میں نہایت مفید و مساعد سمجھی جاتی ہی۔ اُردو شاعری سر سے پاؤں تک فارسی شاعری کے قالب میں ڈھالی گئی تھی۔ مرزا غالب فارسی کے بھی نہایت عالی مرتبہ شاعر مانے گئے ہیں

اور مجموعی طور پر اہل الرائے آج کل انھیں نہ صرف ہندوستان بلکہ دُنیا کے بہترین شعرا میں شمار ہونے کا مستحق جانتے ہیں۔ غرض ایسے شخص کے اشعار پر بے دھڑک اعتراض کر دینا یا اس کو اصلاح دینے کا دعویٰ کرنا ہمارے خیال میں ایک ناروا جسارت ہے۔ لیکن نواب حیدر یار جنگ صاحب نے چند اور اشعار میں اصلاح دینے کے علاوہ ایک جگہ تو یہ ستم کیا ہے کہ مرزا غالب کو لکھنؤ کے نیم خواندہ کاپی نویس کے ہاتھ سے اصلاح دلوائی ہے۔ یعنی اس شعر کی شرح میں کہ "پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے" لکھتے ہیں کہ "عود ہندی میں پیچ کا لفظ مصنف کی زبان پر بتذکیر ہے مگر اس شعر میں یہ تانیث ہے۔ غالباً یہ سبب ہوا کہ پہلے یہ دیوان لکھنؤ میں چھپا وہاں کاتب نے تصرف کر دیا پھر مصنف نے بھی اُسے یونہی رہنے دیا۔" (صفحہ ۲۵۷)

گویا خود مرزا غالب (نواب حیدر یار جنگ کی طرح) اپنی زبان دانی کو اس قدر کم رُتبہ جانتے تھے کہ انھوں نے لکھنؤ کے ایک غیر معروف کاتب کی رائے کو اپنی رائے اور معلومات پر ترجیح دی اور اس خوش نصیب لکھنوی کے قول کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔ ؟ لیکن نواب حیدر یار جنگ صاحب کو غالباً معلوم ہوگا کہ پیچ کا لفظ دہلی میں بالاتفاق مونث بولتے ہیں اور اگر مرزا غالب پہلے اس کو مذکر سمجھتے بھی تھے تو ظاہر ہے کہ بعد میں انھوں نے اس شہر کی زبان اختیار کر لی ہوگی جو لڑکپن سے اُن کا وطن کا بن گیا تھا۔

طرفہ تر یہ کہ نواب صاحب مرزا غالب کی اُستادی کے بھی معترف ہیں اور اس شعر کی نسبت کہ؎

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

لکھا ہے کہ یہ مرزا صاحب کی "بلاغت کی سند اور اُستادی کی دستاویز ہے۔" (صفحہ ۱۳۲)

اسی طرح ؎

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "اگر اس شعر پہ مرزا غالب خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو بالکل بجا ہے" (صفحہ ۱۹۶)

[illegible]

(۱) کہوں کس سے میں کہ کیا ہی شبِ غم بُری بلا ہی — مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا (صفحہ ۲۱)

(۲) اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا! (صفحہ ۴۲)

(۳) اسدؔ بسمل ہی کس انداز کا قاتل سے کہتا ہی — کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر (صفحہ ۶۰)

(۴) نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں (صفحہ ۱۱۰)

ان دو شعروں کی تشبیہ کو بھی نواب صاحب نے بہت سراہا ہی اور لکھا ہے کہ "انصاف یہ ہے کہ متحرک کی تشبیہ میں مصنف کو یدِ طولی ہی:-

(۱) رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہی — نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کشتہ ہی (صفحہ ۱۵۰)

(۲) اچھا ہے سرانگشتِ حنائی کا تصوّر — دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی (صفحہ ۲۰۰)

اس غزل کے متعلق کہ "نکتہ چیں ہی غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے — الخ لکھا ہی کہ "ساری غزل مُرصّع کہی ہے اور یہی رنگ غزل خوانی کا ہی" (صفحہ ۲۱۵)

ایک قصیدے کی تشبیہ کی تعریف میں جس کا مطلع ہی ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ اُردو میں "جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہی اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی" (صفحہ ۲۸۶)

اس طرح بعض اور مقامات پر بھی نواب صاحب نے مرزا غالب کے حُسنِ بیان کی داد دی ہی لیکن جیسا کہ ہم نے ابتدا میں بیان کیا اُن کے اعتراضات کی تعداد ان تعریفوں سے کہیں زیادہ ہی اور یوں بھی اس شرح کے متعلق بعض باتیں تفصیل و اطمینان سے بحث کے قابل ہیں جس کے لئے ناظرین رسالہ اُردو آیندہ نمبر کا انتظار فرمائیں۔

حیدرآباد دکن

۱۷ جمادی الاول سنہ ۴۰ھ

خاکسار

سید ہاشمی فریدآبادی

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن

اور

دیسی زبانوں کی تعلیم

از اڈیٹر

اس سے قبل کہ دیسی زبانوں کی تعلیم اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے متعلق کمیشن کی تحقیقات اور رائے کا ذکر کیا جائے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی عہد کے ابتدا میں مشرقی تعلیم کے متعلق جو کوشش کی گئی اس کی مختصر تاریخ بیان کر دی جائے، تاکہ بیان مسلسل ہو جائے اور اس کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ مشرقی و مغربی اور مادری زبان کی تعلیم کا تعلق ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ ایک کے بیان میں دوسرے کا ذکر ناگزیر ہے۔

مشرقی تعلیم کی مختصر تاریخ

جب انقلاب زمانہ سے ہندوستان کی قسمت "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے ہاتھ میں پہنچی تو کمپنی نے اپنے زیر انتظام علاقہ میں عدالتیں قائم کیں۔ لیکن انگریز جج ملک کے حالات، لوگوں کے خصائل و عادات اور قانون نافذ الوقت کی نشناسی بالکل نابلد تھے۔ اس لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ہر عدالت میں ایک مولوی اور ایک پنڈت رکھا جائے جو معاملات کے سلجھانے اور قانون کی تعبیر میں مدد دے۔ لیکن اعلیٰ قابلیت کے مولوی اور پنڈت اس خدمت کے قبول کرنے سے ابا کرتے تھے۔ کچھ تو اس خیال سے اور کچھ مسلمانوں کے خوش کرنے کے لئے لارڈ وارن ہیسٹنگز

گورنر جنرل نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ قائم کیا جس میں مسلمان طلبہ کو فارسی عربی کی تعلیم دی جانے لگی۔ دس سال بعد (۱۷۹۱ء میں) انگریزی رزیڈنٹ مسٹر جاتے تھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت کالج کا ڈول ڈالا جس میں اب تک سنسکرت کی تعلیم ہوتی ہے۔

جب کمپنی نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو ملک میں ابتری اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی اور بہت سے مدارس جو اس وقت تک قائم تھے اور جگہ جگہ اشاعتِ علم کا فرض ادا کر رہے تھے رفتہ رفتہ تنزل کرنے لگے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کا حامی و سرپرست یا تو دنیا سے اُٹھ گئے یا گردشِ زمانہ کے ہاتھوں ایسے مجبور اور پریشان خاطر ہو گئے کہ آپ جوگے رہے اور نہ اور کے گوں کے۔ اُن کی جگہ جو حاکم ہوئے وہ محض اجنبی تھے اور اُن کے آگے ہاتھ پھیلانا غیرت نے گوارا نہ کیا۔ اس زمانہ کے مشہور مستشرق ہنری ٹامس کول برک نے ایک یادداشت لکھی ہے جس میں اُس وقت کے علمی تنزل کا خاکہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان میں علم و ادب کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے۔ نہ صرف علما کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے بلکہ وہ جماعت بھی جس میں سے یہ جوہر قابل پیدا ہوتے تھے محدود ہوتی جاتی ہے۔ علوم نظری کا مطالعہ لوگ چھوڑتے جاتے ہیں۔ علم ادب کی طرف مطلق توجہ نہیں اور سوائے خاص خاص مذہبی معتقدات کے کسی علم کا ذوق باقی نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سی بیش بہا کتابیں ضائع ہو جائیں گی۔ اور اگر گورنمنٹ نے سرپرستی اور ہمدردی نہ کی تو اندیشہ ہے کہ صرف کتابیں ہی مفقود نہ ہو جائیں گی بلکہ اُن کے پڑھانے والے بھی مفقود ہو جائیں گے۔ اس انحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ پہلے بادشاہ اور اُمرا علم اور اہلِ علم کے قدردان تھے اور طرح طرح سے اُن کے ساتھ رعایتیں کرتے اور مدد دیتے تھے۔ اور وہ اطمینان خاطر کے ساتھ درس و تدریس اور تحقیق و تدقیق کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ ان ذرائع کے مفقود ہونے سے یہ ہُوا کہ اُن مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے آتے تھے، آج وہاں علم کی کساد بازاری ہے۔ اب بھی شاہزادے، نواب اور زمیندار جنھیں اپنے باپ دادا سے علم کا شوق پہونچا ہے تھوڑی بہت مدد کرتے رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ قوم جو سلطنت کے دوسرے حصوں میں علم کی محبت کے لئے مشہور ہے اس نے ہندوستان کے علم و ادب کی ترقی میں کوئی مدد نہ دی۔ قومی اور ملکی مدارس کے تباہ ہونے اور علمی انحطاط کی وجہ سے جہالت

بڑھتی جاتی ہے اور جہالت کے ساتھ ساتھ جرائم میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔

۱۔ سنسکرت کی تعلیم

اس کے بعد اس یادداشت میں سنسکرت کالج بنارس اور کلکتہ مدرسہ کی اصلاح کی تجاویز پیش کی ہیں نیز ندیا اور ترہٹ میں دو اور سنسکرت کالج قایم کرنے کی بھی تجویز کی ہے۔ لیکن ان تجاویز کو عملی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

۱۸۱۳ء میں یہ قرار پایا کہ ایک لاکھ کی رقم ہندی علما کے زیرِ اثر علم ادب کے احیاء و ترقی اور سائنس کے آغاز و اشاعت کے لئے صرف کی جائے۔ مستشرقین اور مشنریوں کی سعی سے یہ رقم مشرقی تعلیم پر صرف ہوئی کیونکہ اُن کا منشا یہ تھا کہ مشرق کے علمی خزانے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں اور اہلِ مغرب کے سامنے پیش کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنارس کالج کا تمام خرچ گورنمنٹ کے ذمہ ہو گیا اور سنسکرت کے دوسرے مدارس کو بھی امداد ملنے لگی۔

۲۔ سنسکرت کالج کلکتہ

جب مشرقی تعلیم کی طرف توجہ ہوئی ہی تو ۱۸۲۴ء میں بعہد لارڈ ایمہرسٹ کلکتہ میں بھی سنسکرت کا ایک کالج قایم ہوا جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ اس ذریعہ سے ہندوؤں کا علم ادب، مذہب اور قانون محفوظ رکھا جائے۔ ابتدا اس کی پچاس طلبہ اور آٹھ پروفیسروں سے ہوئی اور منطق، فقہ، فلسفہ، صرف و نحو، نجوم (ہیئت) اور طب کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۲۷ء میں انگریزی جماعتیں بھی کھولی گئیں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور آٹھ سال بعد ۱۸۳۵ء میں بند کرنی پڑیں۔ لیکن ۱۸۴۲ء میں جب تعلیمی مصلحتوں میں پھر تغیر ہوا تو انگریزی کی تعلیم دوبارہ شروع کی گئی۔ ۱۸۵۱ء کا سنہ اس کالج کی تاریخ میں قابل یادگار ہے۔ کیوں کہ اس سنہ میں نامور پنڈت ایشور چندر ودیاساگر کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ فاضل پرنسپل نے طریقۂ تعلیم، کتب نصاب اور انتظامی امور میں بہت کچھ اصلاحیں کیں خصوصاً مغربی طریقۂ تعلیم کو رائج کیا اور تمام ہندوؤں کو شرکت کی اجازت دی اس سے قبل صرف برہمن ہی تعلیم

پا سکتے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں پرنسپل پنڈت مہیش چندر نیایا رتن نے خالص سنسکرت کی جماعتیں قایم کیں جن میں طلبہ کو بعد امتحان ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ اس شعبہ میں قدیم طرز پر تعلیم دی جاتی ہے۔ پروفیسر قدیم طرز کے موروثی پنڈت ہیں اور وہ اسی قدیم طریقہ پر تعلیم دیتے ہیں۔ پہلے طب کی بھی تعلیم ہوتی تھی لیکن جب سے میڈیکل کالج قایم ہوا ہے پُرانی طب کی تعلیم اس کالج سے موقوف کر دی گئی۔ اب اس کالج میں تین شعبے ہیں (۱) اینگلو سنسکرت کالج (۲) اینگلو سنسکرت سکول (۳) خالص سنسکرت کا شعبہ۔

پہلا شعبہ بعض مضامین میں بی۔ اے تک کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ یہ انتظام انڈین یونیورسٹیز ایکٹ کے نافذ ہونے پر ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ اس سے قبل انٹرمیڈیٹ یا بی۔ اے کی جماعتیں نہ تھیں۔ جو طالب علم اس کالج میں داخل ہوتے وہ سنسکرت کو چھوڑ کر باقی مضامین کی تعلیم پریسیڈنسی کالج میں پاتے۔ اُس زمانہ میں اس کالج سے طلبہ ایم۔ اے کے امتحان میں بھی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ سنسکرت کے امتحان ایم۔ اے میں جس قدر طلبہ کامیاب ہوئے ہیں وہ سب اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

دوسرا شعبہ صرف میٹرکولیشن تک ہے جس میں دس جماعتیں ہیں ادنےٰ پانچ جماعتوں کی تعلیم دیسی مدارس کے اصول پر ہے اور اوپر کی پانچ جماعتوں کی تعلیم اینگلو سنسکرت اصول پر۔

تیسرا شعبہ خالص مشرقی ہے جس میں صرف و نحو، وید، ہیئت (نجوم) کی تعلیم ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کے جدید قواعد نافذ ہونے کے بعد سے اس کے طریقۂ تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہے۔ یعنی اب علاوہ قدیم طریقہ کے پنڈتوں کے انگریزی داں عالم بھی اساتذہ میں شریک کئے گئے ہیں۔ اور قدیم اور جدید طریقۂ تعلیم کے سمونے کی کوشش کی گئی ہے اور قدیم متن اور شرح کے ساتھ جدید تنقید اور تحقیق کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم السنہ و علوم کی تعلیم کا یہی بہتر اور مناسب طریقہ ہے۔

۳۔ سنسکرت کے خانگی مدارس

سنسکرت کالج کے قایم کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ خانگی مدارس کے لئے نمونہ ہو اور یہ مدرسے اُسی کی تقلید کریں۔ قدیم طرز کی تعلیم میں امتحانات کی یہ صورت نہ تھی جو مدارس میں رائج ہے۔ بلکہ علما کے عام جلسوں میں زبانی بحث

مباحثے ہوتے تھے اور اسی پر سے طلبہ کی لیاقت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان بنگال میں بعض سبھائیں اس غرض سے قایم ہوئیں کہ خانگی مدارس کے طلبہ کا باقاعدہ امتحان لیا جائے۔ ان سبھاؤں نے اپنی اپنی سندیں (ڈگریاں) دینی شروع کیں۔

۱۸۸۵ء میں پنڈت مہیش چندر نیا یارتن پرنسپل سنسکرت کالج کی تحریک پر بنگال گورنمنٹ نے سنسکرت کے امتحانات کا طریقہ رائج کیا۔ ان امتحانات کے قایم ہونے اور سرکاری اسناد (ڈگریاں) ملنے پر قدیم طرز کی سنسکرت تعلیم کا بہت شوق بڑھا اور دُور دُور سے طلبہ ان امتحانات میں شریک ہونے کے لئے آتے تھے ان امتحانات کے تین درجے رکھے گئے ہیں۔ ابتدائی، وسطانیہ اور اعلیٰ (جو ڈگری کا امتحان ہوتا ہے) چوں کہ گورنمنٹ کو وقتاً فوقتاً ان مدارس کو امداد دینی پڑتی تھی۔ لہذا پنڈت مہیش چندر ان مدارس کی تحقیق حالات کے لئے مقرر کئے گئے۔ اور انھوں نے ایک بسیط اور عمدہ رپورٹ مرتّب کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاص خاص مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کو امتحانات کے نتائج پر الاؤنس اور وظیفے دیئے جانے لگے۔ یہ امتحانات پہلے مسلمہ سبھاؤں کے زیر نگرانی ہوتے تھے لیکن بعد میں پرنسپل سنسکرت کو تفویض کر دیئے گئے۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں بعض ذی اثر اصحاب نے ایک میموریل لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا اور یہ درخواست کی کہ ان امتحانات کے انتظام اور نصاب تعلیم کی ترتیب اور عطائے وظائف میں پرنسپل سنسکرت کالج کے ساتھ قدیم طرز کے پنڈت بھی شریک کئے جائیں۔ چنانچہ اس پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس سنسکرت دانوں کی بصدارت ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن) منعقد ہوئی جس میں مجلس شوریٰ و امتحانات کے قیام کی سفارش کی گئی۔ یہ مجلس بورڈ آف سنسکرت ایگزامینیشن کے نام سے قایم ہوئی۔ اس میں گیارہ رُکن تھے جن میں سے چھ قدیم طرز کے پنڈت تھے۔

۱۹۱۳ء میں بنگال گورنمنٹ نے اس غرض سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا کہ بنگال احاطہ میں سنسکرت کی اشاعت و ترقی کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کانفرنس نے خاص خاص تجویزیں اس کے متعلق پیش کیں لیکن جو پنڈت اس کانفرنس میں شریک تھے اُن سب نے بالاتفاق اس پر اصرار کیا کہ جس طرح ڈھاکہ یونیورسٹی کمیٹی نے اسلامی علوم و السنہ کی تعلیم کے لئے خاص انتظام تجویز کیا ہے ویسا ہی انتظام سنسکرت کی تعلیم کا بھی کیا جائے۔

مشرقی بنگال اور آسام کے پنڈتوں کی یہ خواہش تھی کہ سنسکرت کا بھی ایک شعبہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں رکھا جائے مگر مغربی بنگال، بہار اور اڑیسہ کے پنڈت یہ کہتے تھے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ ایک سنسکرت کالج بطور اُس کی شاخ کے قایم کیا جائے۔ پنڈتوں کی یہ قطعی رائے تھی کہ تمام صوبہ کے لئے قدیم طرز کی سنسکرت کی تعلیم کے لئے ایک انتظام ہونا چاہیئے جو یونیورسٹی کی تعلیم سنسکرت سے جُدا ہو۔ اور اس کا نام "کلکتہ سنسکرت ایسوسی ایشن" ہو۔

۱۹۱۸ء میں اس رپورٹ پر بنگال گورنمنٹ کا رزولیوشن شائع ہوا جس میں کانفرنس کی خاص خاص تجویزوں کو منظور کیا۔ منجملہ ان کے پانسو پنڈتوں کی ایک کانووکیشن قایم کی گئی اور علاوہ اس کے ایک انتظامی مجلس قایم ہوئی جس میں علاوہ پریزیڈنٹ اور سکرٹری کے بیس رکن تھے۔ ان بیس میں قدیم طرز کے پنڈتوں کی تعداد پندرہ تھی۔ چنانچہ "کلکتہ سنسکرت ایسوسی ایشن" قایم ہوگئی اور امتحانات اور طلبہ و مدرسین کو نتائج امتحانات پر وظائف و انعام دینے کا انتظام اس کو تفویض کردیا گیا۔ یہی مجلس گورنمنٹ کو سنسکرت کے تعلیمی امور اور امداد عطا کرنے کے متعلق مشورہ دیتی ہے۔ بعد میں بہار اور اڑیسہ کے الگ ہونے پر وہاں بھی ایک ایسی ہی مجلس قایم کی گئی۔

اس قسم کی درسگاہیں بنگال میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہیں اور یہ سب اسی مجلس کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کے نگراں اور منتظم اور مدرس سب قدیم طرز کے پنڈت ہیں اور اسی قسم کی تعلیم ان میں دی جاتی ہے۔ افسوس کہ ابھی تک کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی کہ یہ لوگ مغربی علم سے بھی فیضیاب ہوسکیں۔ ایسی صورت پیدا ہونے سے ان کی نظر زیادہ وسیع ہوجائے گی اور اُن کا علم زیادہ کامیاب اور مفید ثابت ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم طرز پر تعلیم دینے سے ان کا علم عمیق ضرور ہوگا لیکن نقص یہ ہے کہ وسعت پیدا نہیں ہوتی۔

دیگر السنہ کی تعلیم

پیروان بدھ کی مذہبی کتب پالی زبان میں ہیں۔ اس زبان میں بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جس سے چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر بارھویں صدی مسیح تک کے ہندوستان کے مذہبی معاشرتی اور سیاسی حالات پر

روشنی پڑتی ہی۔ یوں تو یہ زبان یونیورسٹی کے امتحانی مضامین میں داخل تھی لیکن سب سے پہلے سنسکرت کالج کے پرنسپل نے امتیاز کے ساتھ اس زبان میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ یہ پہلا امتحان تھا اور ممتحن انگلستان اور جرمنی میں تلاش کرنے پڑے۔ اس کے بعد سے بعض ملحقہ کالجوں میں بی۔ اے تک کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہی اور یونیورسٹی نے اندر گریجوائٹوں اور گریجوائٹوں میں پالی زبان کی اشاعت کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہی۔ چنانچہ گزشتہ چند سال سے یونیورسٹی نے خاص کر اُن طلبہ کے لئے جن کے کالج اس زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکتے تھے۔ پالی زبان کے لکچرار مقرر کئے ہیں۔ علاوہ سنسکرت کالج کے پرنسپل کے یونیورسٹی پروفیسروں میں چند ممتاز گریجوایٹ ہیں ان میں سے ہر ایک پالی میں ایم۔ اے کا امتحان بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہی۔ اور ایک کو لندن یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری عطا کی ہی اس نے فلسفۂ بدھ پر ایک بسیط مقالہ لکھا تھا۔ علاوہ اس کے پروفیسروں میں تین بدھ راہب ہیں جو بدھ کے فلسفہ، مذہب اور روایات سے کامل طور پر واقف ہیں۔

یونیورسٹی نے تبتی زبان پر توجہ کی ہی اور بعض منتخب کتب کو شائع کیا ہی اور انگریزی تبتی لغت بھی تیار کرائی ہی۔ ڈاکٹر و دیا بھوسن کو تبتی زبان کا معلم مقرر کیا ہی اور ایک وظیفہ بھی اُس گریجوایٹ کے لئے تجویز کیا ہی جو تبتی زبان کی تحصیل کرے گا۔ علاوہ اس کے اور کئی کتابیں تبتی زبان کے متعلق بڑے اہتمام سے تیار ہو رہی ہیں۔ تبتی زبان کی تعلیم و تحقیق سے بدھ کے زمانہ کے بہت سے حالات معلوم ہوں گے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہی کہ ساتویں صدی سے بارھویں صدی تک ہندی مشنری بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے تبت میں پہنچتے رہے ہیں اور یہاں سے بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لے گئے تھے جو ہندوستان میں مفقود ہیں مگر تبت میں اب تک موجود ہیں۔ غرض تبتی زبان میں بہت کچھ سرمایہ ہی جو ہندوستان کی تاریخ، زمانہ بدھ کی معاشرت اور بدھ کے فلسفہ و مذہب کے سمجھنے میں بہت مدد دے گا۔

کمیشن کی رائے ہی کہ چینی اور جاپانی زبانوں کی طرف بھی یونیورسٹی کو توجہ کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ ارباب تحقیق کے لئے قدیم ہندوستان کے تمدن و تاریخ کا بہت سا سرمایہ ان زبانوں میں موجود ہی۔ چند سال ہوئے یونیورسٹی نے مسٹر یاماکامی کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہ چینی ماخذات کو لے کر بدھ فلسفہ پر لکچر دیں۔ چنانچہ یہ لکچر بہت مشہور ہوئے

حال ہی میں یونیورسٹی نے چینی اور جاپانی کے تین مُعلّم مقرر کئے ہیں جن کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ چینی اور جاپانی ماخذات سے بدھ فلسفہ کی تحقیق کریں۔ ان میں دو جاپانی عالم ہیں جو ہندوستان میں سنسکرت اور ہندی فلسفہ کی تحصیل و تحقیق کے لئے آئے تھے۔ یہ یونیورسٹی کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے ایسے فاضل دستیاب ہو گئے۔

زند کا تعلق بھی ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے بہت کچھ ہے اور ایک پارسی عالم جو لسانیات کا پروفیسر ہے اس زبان کی تعلیم دیتا ہے اور بعض محققانہ کام کر رہا ہے۔

عربی مدارس

جب انگریزوں کے قدیم بنگال میں جم گئے اور انھوں نے اس خطّہ کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو انتظامی صیغوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم نے دیوانی ایسٹ انڈیا کے حوالہ کردی۔ اس سے مسلمانوں کی سیاسی حالت میں بہت بڑا تغیر پیدا ہوا۔ حسب معاہدہ سرکاری زبان فارسی ہی رہی اور عدالتی اور مالی انتظام اسلامی شرع کے مطابق انجام پاتا رہا۔ اس کام کے لئے قابل مولویوں کی ضرورت رہتی تھی۔ لیکن اعلیٰ پایہ کے علما سرکاری ملازمت قبول کرنے سے اباکرتے تھے اس لئے وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی تاکہ اس کے تعلیم یافتہ اسلامی شرع کے مطابق عدالت اور دوسرے انتظامی صیغوں میں مدد دے سکیں۔ دوسری وجہ اس کے قیام کی وارن ہیسٹنگز نے یہ بیان کیا ہے کہ مالگزاری کا انتظام جب سے ہمارے ہاتھ میں آیا ہے تو اس کام کو یا تو کمپنی کے انگریز ملازم انجام دیتے ہیں یا ہندو جو بوجہ کفایت شعاری اور محنت کے عادی ہونے کے حساب اور فنانس کا کام مسلمانوں سے بہتر کرتے ہیں۔ اس تغیر سے مسلمان خاندانوں کی آمدنی کو بہت نقصان پہنچا ہے اور وہ اپنی اولاد کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کر سکتے۔

۱۸۲۸ء میں گورنمنٹ نے اراضیات کے پٹوں اور انعامات کی تحقیق شروع کی۔ اٹھارہ سال کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی اراضیات گورنمنٹ کے قبضے میں آگئیں اور اس سے مسلمانوں کے مدارس کو سخت نقصان پہنچا کیوں کہ ان کی آمدنی کا دارمدار اوقاف پر تھا جو اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تعلیمی مسئلہ پر مشرقیوں اور مغربیوں میں بڑے گرم مباحثے ہو رہے تھے۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اپنی تحریر مؤرخہ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء

میں صاف طور پر اپنا رجحان انگریزی تعلیم کی ترقی کی طرف ظاہر کر دیا تھا۔ ۲ر فروری ۱۸۳۵ء کو لارڈ میکالے نے اپنی مشہور یادداشت تحریر کی اور ۷ر مارچ ۱۸۳۵ء کو لارڈ ولیم بنٹنک نے اُسی کی بنا پر اپنے فیصلے کا اعلان سرکاری رزولیوشن کے ذریعہ سے کیا۔ اس رزولیوشن میں علاوہ دوسرے امور کے ایک یہ بھی تھا کہ اس کے بعد کوئی وظیفہ کسی ایسے طالب علم کو نہیں دیا جائے گا جو دیسی علوم کی تحصیل کی غرض سے کسی مدرسہ میں داخل ہوگا۔ کلکتے کے مسلمانوں نے اس فیصلے کے خلاف ایک درخواست پیش کی جس پر آٹھ ہزار اشخاص کے دستخط ثبت تھے اور جس میں گورنمنٹ کو یہ الزام دیا گیا تھا کہ گورنمنٹ جو انگریزی تعلیم کی تائید کرتی ہے اور اسلامی اور ہندو علوم کی مخالف ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اہل ہند عیسائی ہو جائیں۔ ایک یہ درخواست تھی اور ایک وہ درخواست تھی جو راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء میں لارڈ امہرسٹ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی تھی جس میں انھوں نے سنسکرت کالج کے قیام کی سخت مخالفت کی تھی اور اس پر اصرار کیا تھا کہ ہمیں مغربی علوم کے مدارس درکار ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی بھی دربار سرکار سے خارج ہوگئی اور دفتری کاروبار یا تو انگریزی میں یا مقامی زبان میں انجام پانے لگا۔ بنگالی مسلمان بنگالی زبان کے استعمال سے اجتناب کرتے تھے۔ اور اُن کے مدارس میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ اس قانون کے نافذ ہونے سے مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ پہنچا اور انھیں یہ خیال ہوا کہ ہمیں بدیسی حکمرانوں ہی کی زبان سیکھنی نہیں پڑے گی بلکہ ان لوگوں کی زبان بھی حاصل کرنی پڑے گی جو تھوڑے دنوں پہلے ہماری رعایا تھے۔ غرض پے در پے کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ جس سے مسلمانوں کی مالی حالت، معاشرت، تعلیم کو نقصان پہنچا اور اُن کے دلی جذبات کو ٹھیس لگی۔

۱۸۳۳ء میں تعلیم کا زمانہ سات سال تھا اور شرعِ اسلامی، صرف و نحو و عام ادب، حساب یا الجبرا۔ اقلیدس۔ منطق یا بلاغت یا فلسفہ ہیئت یا دینیات اور سرکاری قوانین و آئین کی تعلیم ہوتی تھی۔ مدرسہ کی کمیٹی نے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی اور اس کے لئے وظیفہ کی مقدار دو سے پانچ روپیہ ماہانہ کر دی نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لڑکے تو بہت سے داخل ہوگئے مگر انگریزی زبان کے حاصل کرنے کا مطلق شوق نہ تھا چنانچہ جب ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میڈیکل کالج قائم ہوا تو اس مدرسہ میں ایک طالب علم بھی ایسا نہ نکلا جو معمولی انگریزی جانتا ہو اور کالج میں داخل ہونے کے قابل ہو۔ اسی قسم کا مگر اس سے کم درجہ کا ایک مدرسہ مرشدآباد میں

قایم کیا گیا۔

مدرسہ کی حالت اس زمانہ میں کچھ ڈانواں ڈول سی رہی خصوصاً انگریزی جماعتیں جو قایم کی گئی تھیں وہ بہت ناکامیاب رہیں، عربی شعبہ کے طلبہ مطلق اس طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں اینگلو عربک جماعتیں خاص عربی شعبہ کے لئے قایم کی گئیں مگر اس میں بھی ناکامیابی ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں کونسل آف ایجوکیشن نے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ کسی یورپین پرنسپل کا تقرر کیا جائے اور اس کے فرائض اور ذمہ داریاں وہی ہوں جو دوسرے کالجوں میں ہوتی ہیں بجز اس کے کہ اس کے لئے کسی جماعت کی تعلیم لازم نہ ہوگی۔ چنانچہ اس خدمت پر ڈاکٹر سپرنگر کا تقرر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے مدرسہ میں بعض ایسی تبدیلیاں کیں جس سے بڑی شورش پیدا ہوئی۔ اس پر کونسل نے ایک کمیٹی تحقیقات کے لئے مقرر کی۔ کمیٹی کی رپورٹ پر کونسل نے ۱۸۵۳ء میں یہ تجویز پیش کی کہ انگریزی اور اینگلو عربک جماعتیں بند کردی جائیں اور بجائے ان کے ایک اینگلو پرشین شعبہ قایم کیا جائے جس میں انگریزی اور فارسی ساتھ ساتھ پڑھائی جائیں۔ لارڈ ڈلہوزی (گورنر جنرل) نے ان تجاویز کو منظور کیا۔

۱۸۵۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ مسلمان یورپی علوم کی تحصیل کی طرف زیادہ توجہ کررہے ہیں۔ مگر کلکتہ مدرسہ کی حالت کو ناقابل اطمینان بتایا اور اُسے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی تحریک کی اور یہ تجویز کی کہ اسے یونیورسٹی سے ملحق کردیا جائے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ مشرقی کالجوں میں انگریزی اور دیسی زبانوں کی تعلیم کا کافی انتظام کیا جائے تاکہ یورپی علم کی اشاعت میں زیادہ آسانی ہو۔

افسوس ہے کہ ان تجاویز پر عمل نہوا اور مدرسہ کی حالت بدستور رہی۔

۱۸۶۹ء میں لفٹنٹ گورنر بنگال نے مدرسہ کے متعلق ایک خاص رپوٹ طلب کی۔ پرنسپل وقت کپتان ولیم ناسولیس نے ایک رپوٹ پیش کی۔ اس پر غور کرنے کے بعد لفٹنٹ گورنر نے یہ تجویز کی کہ عربی شعبہ موتوف کردیا جائے اور اینگلو پرشین شعبہ بدستور قایم رہے اور عربی زبان کی پروفیسری کلکتہ یونیورسٹی یا پریسیڈنسی کالج میں قایم کردی جائے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کی رائے یہ تھی

کہ بجائے اس شعبہ کے موقوف کرنے کے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ کونسل آف ایجوکیشن نے ۱۸۵۳ء میں جو اصلاحیں تجویز کی تھیں اُن پر کامل طور سے عمل کیا جائے۔ سکرٹری آف اسٹیٹ نے بھی اس سے اتفاق کیا (۱۸۶۱ء) ۱۸۶۷ء میں اینگلو پرشین شعبہ کا الحاق بحیثیت سیکنڈ گریڈ کے کلکتہ یونیورسٹی سے ہوگیا لیکن جب جماعتوں کا افتتاح ہوا تو صرف چھ طالب علم اس میں شریک ہوئے۔ دوسرے سال ان کی تعداد چار رہ گئی اور تیسرے سال صرف تین اور وہ بھی سال کے اندر چھوڑ کر چلدیئے۔

۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ بنگال نے پھر ایک بار مدرسے کے دریافت حالات کے لئے ایک کمیٹی قایم کی۔ کمیٹی نے اپنی رپوٹ میں یہ رائے دی کہ مدرسہ کا اینگلو پرشین شعبہ بند کردیا جائے اور ایک تجویز یہ کی کہ ہر سال مسلمان طلبہ کی خاص تعداد پریسیڈنسی کالج میں کم شرح فیس پر داخل کی جائے یہ انتظام اب تک جاری ہے۔

۱۸۸۲ء کے انڈین ایجوکیشن کمیشن میں مسٹر امیر علی (رائٹ آنریبل سیّد امیر علی) نے جو شہادت دی ہے اس میں ان مدرسوں کی تعلیم کے متعلق بہت بے اطمینانی ظاہر کی ہے اور مسلمانوں کے لئے مضر بتایا ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ نہ دنیاوی معاش حاصل کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور نہ جدید علوم و تمدن سے واقف ہوتے ہیں انگریزی زبان لازم قرار نہ دینے سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا جس کی تلافی اب مشکل ہے۔

شمالی ہند بنگال کی نسبت زیادہ خوش قسمت رہا۔ وہاں سرسید احمد خاں مرحوم کی بے نفس مساعی کی بدولت انگریزی تعلیم کو زیادہ ترقی ہوئی حالاں کہ انگریزی تعلیم وہاں بہت بعد میں پہنچی ۱۸۸۶ء میں سرسید مرحوم نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی جس نے اُن کے مقاصد کی اشاعت میں بہت مدد دی۔ جب پنجاب میں اورینٹل کالج قایم ہونے والا تھا تو سرسید مرحوم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ مسلمان طلبہ اُسے سستا کالج سمجھکر داخل ہوں گے اور انگریزی تعلیم سے بے بہرہ رہجائیں گے۔

۱۸۸۲ء سے کلکتہ مدرسہ کی انگریزی شاخ زیادہ مقبول ہونی شروع ہوئی۔ مگر باوجود اس کے مدرسہ کی تعلیم میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔

ایک بار پھر کوشش کی گئی کہ کلکتہ مدرسہ اور دوسرے مدرسوں کو جو اس کے متعلق ہیں معمولی اسکولوں اور کالجوں کے اصول پر کردیا جائے تاکہ وہ جدید حالات اور ضروریات کے مطابق ہوسکیں ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ

بنگال نے یہ تجویز کی کہ ایک خاص درجے کے بعد عربی شعبہ کے دو نصاب کر دیئے جائیں۔ ایک میں کچھ انگریزی اور کچھ مشرقی تعلیم ہو اور دوسرے میں خالص مشرقی۔ یہ تجویز منظور نہیں ہوئی۔ کیوں کہ یہ خیال کیا گیا کہ مشرقی تعلیم کم کر کے انگریزی پڑھائی جائیگی اور اس پر بھی انگریزی کا علم ناقص رہیگا۔ بنگال گورنمنٹ کے رزولیوشن مورخہ ۲ر فروری ۱۹۰۳ء میں یہ خیال کیا گیا کہ جو مسلمان طالب علم اچھی طرح انگریزی سیکھنی چاہتے ہیں انھیں کلکتہ مدرسہ کے اینگلو پرشین شعبہ میں داخل ہونا چاہیئے جہاں فارسی اور عربی میٹرکولیشن کے امتحان کے لئے بطور اختیاری مضامین کے پڑھائی جاتی ہے۔

۱۹۰۶ء میں مسٹر ارل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بنگال نے گورنمنٹ میں یہ تحریک پیش کی کہ مسلمان اصحاب کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے اور اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ آیا کلکتہ مدرسہ میں ایک ایسا امتحان قائم کیا جائے جس کی کامیابی پر سند (ڈگری) دی جائے۔ علاوہ اس کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق دیگر مسائل بھی پیش کئے جائیں۔ اس کانفرنس کا پہلا جلسہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ اس میں پچاس ارکان تھے جن میں مشرقی بنگال اور آسام کے نائبین نیز بورڈ آف اگزامینرز کے سکرٹری اور کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل بھی شریک تھے۔

کانفرنس نے تین سب کمیٹیاں قائم کیں۔

(۱) مدرسوں میں ڈگری کا امتحان اور انگریزی تعلیم پر غور کرنے کے لئے۔
(۲) مکتبوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اُن کی اصلاح و ترقی کے لئے۔
(۳) اُردو زبان کی تعلیم کے متعلق۔

تمام تجاویز کمیٹی کے سامنے ۲۲ر اپریل ۱۹۰۸ء کو پیش ہوئیں اور ناظم تعلیمات نے تمام کارروائی کا خلاصہ مقامی گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیا۔ کانفرنس میں یہ امر طے پایا کہ مدرسوں کا نصاب تین حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے ادنیٰ جو چھ سال کا اور اسکول کی جماعتوں میں پڑھایا جائے گا۔ اعلیٰ جو کالج کے لئے ہوگا اور اس کی مدت پانچ سال ہوگی۔ ڈگری (سند) کے امتحان کے لئے جس کی مدت تین سال ہوگی۔ ڈگری کے امتحان کی جماعتیں کلکتہ مدرسہ میں قائم کی گئیں۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کی تعلیم ہگلی اور دوسرے مدرسوں میں ہونے لگی جو اپنے طلبہ کو ڈگری کے امتحان

کے لئے بنگال کے مدرسوں میں بھیجنے کے مجاز کئے گئے۔

ادنیٰ نصاب میں اُردو، فارسی، عربی، حساب، جغرافیہ جہاں، تاریخ ہند اور ڈرل شریک کی گئی حالانکہ اُردو بعض مدرسوں میں اکثر طالب علموں کی مادری زبان نہ تھی تاہم ذریعۂ تعلیم عام طور پر اُردو ہی تھا۔ اس لئے معتد بہ وقت اس زبان کی باقاعدہ تعلیم کے لئے رکھا گیا۔ فارسی کی تعلیم کے لئے ڈائرکٹ میتھڈ (یعنی تعلیم بذریعہ گفتگو کا طریقہ) رائج کیا گیا۔ حساب کا نصاب موجودہ امتحان میٹرکولیشن کے حساب کے برابر رکھا گیا۔

اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں حساب کی نظرثانی، اقلیدس کے پہلے چار مقالے، منطق، بلاغت، فلسفہ شرع اسلامی، عربی زبان وادب، فارسی زبان وادب تجویز کی گئی۔ جو انگریزی لیتے اُن کے لئے فارسی اختیاری مضمون قرار دیا گیا۔

ڈگری کے امتحان کے لئے ذیل کے مضامین میں سے کوئی ایک نصاب۔

(۱) حدیث، تفسیر، عقاید

(۲) فقہ، اصول فقہ، تاریخ اسلام

(۳) ادب، بلاغت، عروض وقافیہ، تاریخ اسلام

(۴) منطق، فلسفہ اور تاریخ اسلام

اس پر بہت بحث رہی کہ انگریزی کو لازم قرار دیا جائے یا نہیں۔ آخر کو یہی قرار پایا کہ لازم نہونی چاہیئے یہ خیال کیا گیا کہ جسے انگریزی پڑھنی ہو وہ کلکتہ مدرسے کے اینگلو پرشین شعبہ میں داخل ہو۔ البتہ یہ تجویز کی گئی کہ ادنیٰ مدرسے کے اوپر کی تین جماعتوں میں اور اعلیٰ مدرسہ کی پانچ جماعتوں میں انگریزی پڑھائی جائے۔ ڈگری کی جماعتوں میں انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ انگریزی کا خاص دو سال کا نصاب اُن طلبہ کے لئے تجویز کیا گیا جو اعلیٰ پانچویں جماعت میں کامیاب ہیں یا جنھوں نے ڈگری کا نصاب لیا ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کی ترغیب کے لئے دو دو روپیہ ماہانہ کے چھ وظیفے تجویز کئے گئے۔ ان وظائف کی مدت ایک سال قرار دی گئی۔ یہ اُن طلبہ کے لئے تھے جو انگریزی اختیاری مضمون کے طور پر لیتے۔

کانفرنس میں اس امر پر بہت بحث رہی کہ انگریزی کی تعلیم کس حد تک ہونی چاہیئے۔ اصل تجویز یہ تھی کہ

انگریزی کی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی کے درجۂ بی۔ اے تک ہو۔ لیکن ڈاکٹر راس نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ یونیورسٹی کے کسی درجہ کا تعلق درست نہیں۔ اُن کا ذاتی تجربہ ہے کہ مدرسوں میں جو تعلیم اسلامی السنہ و علوم کی اس وقت ہوتی ہے طلبہ میں اس سے کافی ذوق علم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کم سے کم نصف درجن ایسے مسلمانوں کو جانتے ہیں کہ اگرچہ انھوں نے کسی ہائی اسکول میں یا میٹرکولیشن کے امتحان کے لئے مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی انگریزی میں اُن کی عملی واقفیت اوسط درجہ کے بی۔ اے سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ خیال کیا گیا تھا کہ اگر طالب علم دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ تین سال اسکول میں اور پانچ سال کالج میں انگریزی زبان کی تعلیم پائے گا تو اُسے انگریزی زبان کا کافی اور اچھا علم ہو جائے گا اور اس کے بعد انگریزی زبان میں دو سال کا خاص نصاب اس علم میں اور اضافہ کر دے گا۔ مسٹر ارل نے یہ تجویز کی کہ اس مدت کی تعلیم کے بعد ایسا طالب علم یونیورسٹی کے بی۔ اے کے مساوی سمجھا جانا چاہیئے ان تجاویز کو لفٹننٹ گورنر نے منظور کر لیا لیکن خاص نصاب اب تک مقرر نہ ہوا۔ اس کمیٹی میں یہ بھی تجویز ہوا کہ ان مدارس میں مدرسین بہتر قابلیت کے ہونے چاہئیں اسی ضمن میں یہ قرار پایا کہ کلکتہ مدرسہ کے لئے چھ سو روپیہ ماہوار پر مصر سے ایک عالم عربی زبان کا بلایا جائے۔

مسٹر ارل نے ایک یہ تجویز بھی پیش کی کہ یہ عام قاعدہ کہ پریسیڈنسی اور بردوان قسمت میں مسلمان طلبہ کا ذریعۂ تعلیم اُردو نہ قایم رکھا جائے۔ لیکن خاص خاص مقامات میں جہاں مسلمان آبادی کثرت سے اُردو زبان بولتی ہے، وہاں تعلیم کا ذریعہ اُردو ہی ہونا چاہیئے۔ اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا یعنی جب اُردو کی تعلیم بحیثیت دوسری زبان کے ہوگی تو اُس کے لئے مدرسین کا تقرر کیا جائے۔ ۱۹۰۹ء میں بنگال گورنمنٹ نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جہاں کہیں اُردو مدرس مہیا ہو سکے بنگال کے اسکولوں میں اُردو زبان کی تعلیم بحیثیت دوسری زبان کے دی جائے۔ بنگال گورنمنٹ نے اُس وقت اُردو کے لئے زائد مدرسین کے تقرر پر زور دیا تھا۔

بنگال کے لفٹنٹ گورنر (سر انڈریو فریزر) نے کانفرنس کی تجاویز کو منظور فرمایا اور ناظم تعلیمات سے درخواست کی کہ حسب گنجائش رقم رفتہ رفتہ ان تجاویز کا نفاذ کیا جائے۔ لیکن مصر سے عربی عالم کے بلانے کے متعلق اس بنا پر اختلاف کیا کہ اس کے لئے گنجائش نہیں۔

تجویزِ اصلاحِ مدارس

مشرقی بنگال کے نائبین نے اس کانفرنس کے فیصلے سے اختلاف کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ نصاب میں جدید حالات کا لحاظ رکھا جائے اور انگریزی پر زیادہ توجہ کی جائے۔ مشرقی بنگال اور آسام کے لئے الگ کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت ظاہر کی گئی اور پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کا انعقاد ۱۹۰۹ء میں میمن سنگھ میں ہوا تھا، ایک مجلس اس غرض کے لئے تجویز کی۔

اس مجلس نے ۱۹۱۰ء میں یہ طے کیا کہ ادنیٰ مدارس میں بجائے چھ سال کے جیسا کہ بنگال میں ہی سات سال کا نصاب ہونا چاہیئے۔ اور اس کی تعلیم میں مفصلۂ ذیل امتیازی صورت ہو۔

۱ - زیادہ تر دنیوی تعلیم ہو۔
۲ - سوائے ڈھاکہ کے باقی مقامات میں ذریعۂ تعلیم بنگالی ہو۔
۳ - فارسی خارج کردی جائے۔
۴ - سوائے ادنیٰ دو جماعتوں کے انگریزی لازم قرار دی جائے۔

نصاب اس طرح کا تجویز کیا گیا کہ طالب علم ادنیٰ مدرسے کے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے ہائی اسکول کی ساتویں جماعت (یعنی نیچے سے چوتھی) میں داخل ہوسکتا ہے یا اعلیٰ مدرسہ کی پہلی جماعت میں قرآن کی تعلیم نیز عربی کی تعلیم جدید اصول پر داخل نصاب کی گئی۔

مدرسہ کا اعلیٰ نصاب چار سال کا رکھا گیا اور کمیٹی نے تجویز کی کہ انگریزی لازم قرار دی جائے۔ اس نصاب میں ریاضی، ابتدائی طبیعیات، فلسفہ، منطق، اصول فقہ وفقہ، عربی زبان وادب اور اصول اسلام داخل تھے۔

ناظم تعلیمات (مسٹر شارپ) نے گورنمنٹ میں ان تجاویز کو پیش کرتے وقت بعض مشکلات کا اظہار کیا جن میں سے خاص مشکلات اخراجات، اُستادوں کی قلت، کلکتہ مدرسے سے قطع تعلق، اور مناسب درسی کتب کا نہونا تھیں۔ مسٹر شارپ نے یہ بھی بیان کیا کہ اس نصاب میں بہت سے مختلف قسم کے مضامین داخل کردیئے گئے ہیں

اور اُسے بہت مشکل کردیا گیا ہے۔

اس کے بعد مسٹر ناتھن نے اس پر کارروائی شروع کی۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ مجوزہ نصاب سادہ ہونا چاہیئے اور جہاں تک مالی حالت اجازت دے حتی الامکان بہت سے مدارس میں رائج کردیا جائے۔ اس غرض کے لئے ۱۹۱۲ء میں ایک کانفرنس قائم کی گئی۔ ابھی یہ کانفرنس اس مسئلہ پر غور رہی کر رہی تھی کہ تقسیم بنگال منسوخ ہوگئی اور گورنمنٹ آف انڈیا نے ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ جدید ڈھاکہ یونیورسٹی میں اسلامی علوم والسنہ کا شعبہ قائم کیا جائے اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اسے منظور کرلیا۔ ادنیٰ کے لئے سات سال کا اور اعلیٰ کے لئے پانچ سال کا نصاب تجویز ہوا۔ ان نصابوں میں قرآن، اُردو، بنگالی، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، انگریزی، عربی ڈرائنگ (نقشہ کشی) دستکاری اور ڈرل کی تعلیم تجویز کی گئی۔

بنگال گورنمنٹ نے اپنے رزولیوشن مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۱۵ء میں اس اسکیم کے متعلق یہ تحریر کیا ہے۔

"گورنر باجلاس کونسل اُس نصاب تعلیم پر جو مسلمان بزرگوں کے مشورہ سے مرتب کیا گیا ہے اظہار اطمینان کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی قوم کے لئے بے انتہا مفید ہوگا۔ چنانچہ اس امر کا فیصلہ کردیا گیا ہے کہ سرکاری مدرسوں میں (باستثنائے کلکتہ مدرسہ) یہ نصاب رائج کیا جائے۔

ایک لحاظ سے اصلاحی مدرسوں کا یہ نصاب ڈھاکہ یونیورسٹی کے اسلامی علوم والسنہ کے شعبہ کا زینہ ہوگا۔ تاہم بجائے خود مکمل ہے۔ اور جو طالب علم مدرسے سے فارغ ہوکر علاوہ اسلامی علوم والسنہ کی یونیورسٹی کے کسی اور [illegible] میں شریک ہونا چاہیں گے تو انھیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوگی۔

اس نصاب میں دو باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔

(۱) فارسی کا نصاب سے خارج ہونا۔

(۲) انگریزی کا بحیثیت لازمی مضمون کے شریک نصاب ہونا

امر اوّل کے متعلق گورنر باجلاس کونسل بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ پچاس برس قبل بنگالی مسلمان جو فارسی سے ناآشنا ہوتا تعلیم یافتہ اور مہذب خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ فارسی کے

بڑے سے بڑے حامی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اصول تعلیم کے بالکل خلاف ہی کہ لڑکے کو پانچ زبانیں پڑھنے پر مجبور کیا جائے یعنی بنگالی، اُردو، انگریزی، عربی اور فارسی۔ بنگالی کا جاننا ناگزیر ہے، اُردو بنگالی مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے درمیان ایک رشتہ ہی یہ بمنزلہ ایک کڑی کے ہی۔ عربی اسلامی زبان ہی۔ فارسی او ر اُردو میں گہرا تعلق ہی، اور گزشتہ پچاس سال میں اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہی۔ گورنر باجلاس کونسل کو یقین ہی کہ اگر اردو مناسب طریقہ سے پڑھائی جائے تو اس سے مسلمانوں کے تہذیب ذوق میں وہی مدد ملے گی جو پچاس سال قبل فارسی کی تعلیم سے ملتی تھی۔ ان حالات میں گورنر باجلاس کونسل نے کسی قدر افسوس کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہی کہ فارسی کو اسکول کے نصاب سے خارج کر دیا جائے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسٹر ارل کی منعقدہ کانفرنس نے بھی فارسی کو انگریزی کے ساتھ اختیاری رکھا تھا۔"

کلکتہ مدرسہ کا نصاب بدستور قدیم ہی رہا

بنگال گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس احاطہ میں ایک سرکاری مدرسہ ایسا ضرور رہنا چاہیئے جس میں قدیم نصاب ہی کی تعلیم ہو، خواہ انگریزی اختیاری مضمون کے حیثیت سے ہو یا مطلق نہو۔ رائیں دریافت کی گئیں کہ کون مدرسہ قدیم نصاب کے لئے مخصوص کیا جائے تو کثرت رائے سے کلکتہ مدرسہ ہی کے لئے معین کیا گیا کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے بھی اس کے متعلق رائیں طلب کیں بائیں میں سے چودہ نے یہی رائے دی۔

مدرسوں کی موجودہ حالت

مدرسوں کا نصاب خواہ قدیم ہو یا جدید چار حصوں میں منقسم ہی۔

(۱) ابتدائی جماعتیں جو مکتب کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ مکتب مدرسوں سے الگ ہیں۔

(۲) تحتانیہ شعبہ جو مڈل کے مساوی ہی۔

(۳) فوقانیہ شعبہ جو ہائی اسکول کے مساوی ہی۔

(۴) اعلیٰ جماعتیں جو یونیورسٹی کی ڈگری کی جماعتوں کے مساوی ہیں۔

بنگال میں فوقانیہ مدارس تیرہ ہیں جن میں سے چار کا خرچ سرکار دیتی ہی سات امدادی ہیں اور باقی غیر امدادی۔ ہر فوقانیہ مدرسہ میں تحتانیہ شعبہ بھی ہی۔ تحتانیہ مدارس ۴۲، ۱ ہیں جن میں سے ایک سرکاری، ۷۹۱ امدادی اور باقی غیر امدادی ہیں۔

بنگال کے فوقانیہ اور تحتانیہ مدارس میں (۲۱۲۲۲) طالب علم ہیں۔ مڈل اور ہائی اسکولوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد ۱۰۳۰۳۸ ہی۔ گویا جملہ مسلمان طلبہ میں سے جو ثانوی تعلیم پا رہی ہیں ۷ء۱۱ فیصدی مدرسوں میں زیر تعلیم ہیں۔ وہ طالب علم جو مکتبوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس میں شریک نہیں ہیں۔ مکتبوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ ہی۔

تحتانیہ اور فوقانیہ مدرسوں کے آخری امتحانات کا کام ایک مجلس کو تفویض کیا گیا ہی جو سر رشتہ تعلیم کے ماتحت ہی۔

اصلاح یافتہ مدرسوں کے نصاب میں عربی زبان اور ادب، شرع اسلامی، بلاغت، منطق (عربی میں)، ریاضی (حساب و علم ہندسہ) انگریزی، تاریخ اور دیسی زبان (بنگالی یا اردو) میٹرکولیشن کے درجہ تک شریک ہی۔ تاریخ ہند انگریزی پڑھائی جاتی ہی۔

ہائی اسکولوں اور ان مدرسوں کے نصاب میں اتنا فرق ہی کہ بجائے الجبرے کے منطق، بلاغت اور اسلامی شرع رکھی گئی اور یہ مضامین عربی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر کتابیں جدید ہیں۔ عربی زبان و ادب کا معیار میٹرکولیشن کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ ہی۔

کلکتہ مدرسہ کا نصاب ان مدرسوں کے نصاب سے مختلف ہی یہ اختلاف ان تین صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

(۱) مدرسہ عالیہ کلکتہ میں انگریزی لازم نہیں۔ طالب علم کو اختیار ہی خواہ فارسی لے خواہ انگریزی۔

(۲) نصاب نظامیہ کی تعلیم ہوتی ہے اور گورنمنٹ نے یہ طے کر دیا ہے کہ وہ اس میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۳) اس کا معیار اعلیٰ ہی اور یونیورسٹی کے درجہ کی تعلیم ہوتی ہی۔

یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی تعلیم

کلکتہ کے انڈر گریجوائیٹوں کو اس کی شکایت رہی ہے کہ فارسی عربی کی تعلیم کا کافی انتظام نہیں ہے اگرچہ مسلمان طلبہ کی تعداد محدود ہی مگر وہ تقریباً تمام کالجوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور اکثر انھیں ایسے کالجوں میں داخل ہونا پڑتا ہی جہاں عربی فارسی کا مطلق انتظام نہیں۔ چند سال ہوئے منتظمین یونیورسٹی نے اسے محسوس کیا کہ مسلمان طلبہ درحقیقت نقصان میں ہیں اور وہ اسلامی تہذیب سے بے بہرہ رہجاتے ہیں۔ اس خیال سے انھوں نے مسلمان انڈر گریجویٹ طلبہ کی خاطر اُن کالجوں میں جہاں فارسی عربی کا انتظام نہ تھا فارسی اور عربی کے معلم مقرر کئے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی نے پوسٹ گریجوایٹ طلبہ کے لئے عربی اور فارسی کی جماعتیں قایم کیں۔ فی الحال چھ لکچرار ہیں۔ دو مشترک۔ ایک خاص عربی کے لئے اور دو فارسی کے لئے ہیں مگر طلبہ کی تعداد بہت کم ہی۔ بعض اوقات فارسی یا عربی کے شعبہ میں ایک طالب علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق یہ کہکر ٹال دینا کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہیں کافی نہیں ہی۔ ایک وجہ یہ بھی ہی کہ ان مضامین کی تعلیم جیسی ہونی چاہیئے نہیں ہوتی۔ کمیشن کی رائے ہی کہ اس کمی کے اسباب کچھ بھی ہوں یہ جماعتیں ضرور قایم رہنی چاہئیں کیوں کہ قطع نظر مسلمانوں کی ضروریات کے اسلامی تہذیب کو بھی ہمیں مد نظر رکھنا چاہیئے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایم۔ اے کے لئے جو نصاب عربی فارسی کا تجویز کیا گیا ہی وہ اس قدر وسیع اور جامع نہیں ہی جیسا سنسکرت اور پالی کا۔ اگر اسلامی علوم و تہذیب کی تحقیق و مطالعہ کے لئے کوئی نصاب تجویز کیا جائے تو اس میں مختلف قسم کے بہت سے مضامین شریک ہوسکتے ہیں اس لئے ایم۔ اے کے لئے جو فارسی عربی کا نصاب مقرر کیا گیا ہی وہ اصلاح و نظر ثانی کا محتاج ہی۔ تاریخ کی مجلس نے جو اسلامی تاریخ کے متعلق پوسٹ گریجوائٹ طلبہ کے لئے لکچروں کا انتظام کیا ہی اس کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک اسلامی تہذیب اندرون ہندوستان دوسرے بیرونِ ہندوستان۔ لیکن اس میں بھی مسلمان طلبہ کی تعداد بہت کم ہی۔

آخر میں کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی ہی کہ بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی رفع کرنے کا سوال اسلامی مدرسوں کی مسئلے کے ساتھ وابستہ ہی۔ ان مدرسوں کو نہ صرف ذہنی و دماغی تعلیم و تہذیب کے حقیقی مرکز بنانے کی

کوشش کرنی چاہیئے بلکہ اس کے ضمن میں زمانۂ جدید کی ضروریات و حالات کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیئے۔

اِن تمام حالات کے پڑھنے کے بعد ایک بات جو دل میں کھٹکتی ہے یہ ہے کہ باوجودیکہ اسلامی مدارس بنگال میں کچھ کم ڈیڑھ سو برس سے جاری ہیں لیکن اُن کے نتائج سنسکرت کالجوں کے مقابلہ میں بہت کم وقعت اور ہیچ ہیں۔ اسی طرح کلکتہ یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالجوں میں جو عربی فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے وہ اس قدر معمولی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بہت کم فائدہ بنگال کے مسلمانوں کو پہنچا ہے۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے سنسکرت کالجوں میں تعلیم حاصل کی ہے یا یونیورسٹی میں رہ کر سنسکرت اور قدیم علوم میں مساوات پیدا کی ہے ان میں بہت سے ایسے اصحاب نظر آتے ہیں جو علم و فضل میں خاص امتیاز رکھتے ہیں اور جنھوں نے علمی تحقیق میں نام پیدا کیا ہے۔ مگر اسلامی مدارس یا یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اس پایہ کے لوگ مفقود ہیں اس سے کہیں زیادہ شمالی ہند کے قدیم عربی مدارس نے کام کیا ہے جہاں جوق کے جوق بنگالی طلبہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں اور پھر اپنے وطن میں واپس آکر اسلامی خیالات اور تہذیب کو پھیلاتے ہیں۔ اس ناکامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ جو روشن خیال انگریز یا مسلمان اسلامی مدارس کے حامی اور ہمدرد تھے اور جن کے ہاتھ میں ان کی ترقی و فلاح تھی وہ اس اہم کام کی پوری صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ کاش اسلامی مدارس کی باگ پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر یا پنڈت مہیش چندر نیا یا رتن جیسے بالغ نظر فضلا کے ہاتھ میں ہوتی جو زمانہ کی ضرورت اور علم کے صحیح اور وسیع معنوں سے آگاہ تھے اور جن کی مناسب تجویزوں اور اصلاحوں سے سنسکرت تعلیم کو بڑا نفع فائدہ پہنچا۔

۲۔ اگرچہ بار بار انتظام اور نصابِ تعلیم کے متعلق مجلسیں منعقد ہوئیں اور گورنمنٹ نے قرار دادیں منظور کیں مگر نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم میں کوئی مفید اصلاح نہ ہوئی اور باوجود مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے تغیرات کے ان مدارس کی تعلیم کا ڈھنگ ویسا ہی رہا اور اس کے افادہ میں کوئی وسعت پیدا نہ ہوئی۔

۳۔ کچھ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی نظر تنگ اور خیالات محدود تھے۔ وہ کسی بڑے تغیر کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ جب مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں اس کے مشہور پرنسپل ڈاکٹر سپرنگر نے بعض ایسی اصلاحیں کرنی چاہیں جن سے مدرسہ کی حالت میں بہت کچھ تغیر پیدا ہو جاتا تو مسلمانوں نے بہت شور و غل مچایا اور اُس کی ایک نہ چلنے دی

یہی ڈاکٹر سپرنگر تھا کہ جب دہلی کالج کا انتظام اس کے ہاتھ میں آیا تو اُس نے اُسے ایک چیز بنا دیا۔

۴۔ اگرچہ ابتدا میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی تعلیم قدیم طرز کی رکھی گئی تھی۔ کیوں کہ ضرورت اسی کی داعی تھی، لیکن بعد میں دوسرے مضامین بھی شریک کیے گئے اور انگریزی زبان کا بھی آغاز ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ مشرقی اور مغربی علوم اور ذوق کو یکجا کیا جائے اور دونوں کو سمو کر نئی کیفیت پیدا کی جائے تاکہ وہاں کے تعلیم یافتہ تحقیق و تنقیدِ علم کی داد دے سکیں اور ملک میں علم کا صحیح ذوق پیدا کریں۔ یہ خیال اعلیٰ درجہ کا ہے اور تعلیمی نقطۂ نظر سے اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس قدر اس کا کہہ دینا آسان ہے اُسی قدر اس کا عمل میں لانا دشوار ہے۔ اس کا تجربہ کئی بار مختلف مقامات میں کیا گیا۔ لیکن اب تک پوری کامیابی کہیں بھی نہیں ہوئی۔ علی گڑھ میں یہ ناکام ثابت ہُوا۔ لاہور کا اورینٹل کالج اب تک ڈاکٹر لائٹنر کی لکیر پیٹ رہا ہے۔ مدرسہ ندوۃ العلما لکھنؤ اسی اصول پر اور اسی نیت سے قایم ہُوا۔ ہردوار کا گروکل بھی غالباً اسی کوشش میں ہے مگر اب تک اس کے متعلق کوئی رائے قایم نہیں کی جا سکتی اور جس کامیابی کی توقع تھی وہ اب تک حاصل نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور نے شانتی نکیتن میں اسی اصول کو مدنظر رکھ جدید یونیورسٹی کا ڈول ڈالا ہے جس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ حیدر آباد دکن میں بھی اسی منشا کے ساتھ وسیع پیمانہ پر یونیورسٹی قایم کی گئی ہے جس کی کامیابی و ناکامیابی اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اس کے منتظم ہیں۔ اس کا فیصلہ زمانہ آیندہ کرے گا۔ احمد آباد، علی گڑھ اور دوسرے مقامات میں قومی یونیورسٹیاں اور کالج حال میں قایم ہوئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ کہاں تک قومی تعلیم کے منشا کو سمجھے ہیں اور کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں اس قسم کی جتنی کوششیں کی گئیں اُن میں صرف ایک جگہ کامیابی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ مرحوم دہلی کالج ہے۔ ڈاکٹر سپرنگر اور اُن کے بعض مددگار اس منشا کے مفہوم کو خوب سمجھے تھے اور اُن کی سعی اور دُوربینی سے تعلیم کا ڈھنگ ایسا پڑ گیا تھا جو اس ملک اور ہمارے طبائع کے مناسب تھا۔ اُس کے بعض تعلیم یافتہ مثلاً ماسٹر رام چندر، مولوی ذکاء اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد، مولوی ضیاء الدین مولوی عبدالکریم وغیرہ ایسے ہیں جنھوں نے علمی لحاظ سے اپنے ملک اور زبان کی ایسی خدمت کی کہ ان کا نام ہماری زبان میں ہمیشہ یاد رہیگا۔ بدنصیبی سے یہی کالج توڑ دیا گیا۔ اس سے بڑھکر عمال کی ناعاقبت اندیشی

کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

اصول نہایت صحیح اور قابل قدر ہے مگر دشواری عمل میں ہے۔ ناکامی کی وجوہ زیادہ تر دو ہیں۔ اوّل جن حضرات نے اس اصول پر کاربند ہونا چاہا وہ یا تو اس اصول کے صحیح مفہوم کو پورے طور پر سمجھے نہیں یا اُن دُشواریوں سے ناواقف تھے جو اِس پر عمل کرنے میں پیش آتی ہیں۔ دوسرے ایسے پروفیسر اور معلّم نہایت مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں جو خود اُن اوصاف سے متصف ہوں جنھیں وہ اپنے طالب علموں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی جو عالمانہ مزاج رکھتے ہوں۔ جن کی نگاہ میں اپنے علوم اور تہذیب کے ساتھ جدید علوم کی وسعت بھی ہو۔ جو قدیم علوم کی پختگی اور استقلال کے ساتھ نئے طرز تعلیم کے اسلوبوں سے واقف ہوں اور دونوں میں پیوند لگانے کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ اور جن کی رواداری تحقیق حق کی راہ میں ایسی عالمگیر ہو کہ کسی قسم کا تعصّب یا توہم یا وسوسہ اُن کے شوق اور جوش میں حائل نہ ہو سکے۔

فانوسِ حیات یا زندانِ موجودات

[نتیجۂ فکر مسٹر آصف علی بیرسٹرایٹ لا - دہلی - از سنٹرل جیل دہلی]

مسٹر آصف علی کسی تعارف کے محتاج نہیں - اُن کی انشا پردازی، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مسلّم ہے - اُن کا ذوقِ ادب بہت پاکیزہ ہے اور وہ ایک نازک خیال شاعر ہیں - آج کل وہ سنٹرل جیل دہلی میں ہیں - اور وہیں سے اُنھوں نے "اُردو" کے لئے ایک نظم بھیجی ہے جو اُن کی دلی کیفیت کی شاہد ہے - (اڈیٹر)

فانوسِ حیات ہے وہ زنداں — ہے شمعِ وجود جس میں عریاں

گُل میں ہے ازل سے رنگ محبوس — ہے شعلۂ بُو کا غنچہ فانوس

پیکر میں بشر کے خوں ہے محصور — ہو چنگ میں جیسے نغمہ مستور

پابندِ سلاسلِ روانی — خود قطروں کی قید میں ہے پانی

صہبا کا قفس بنا ہے مینا — ہیں حبلیاں رز کی صیدِ صہبا

ہے دُرجِ صدف میں قید، گوہر — شعلہ ہے اسیرِ دامِ اخگر

کہسار — وہ ہمجلیسِ دوراں — وادی میں کھڑے ہیں پا بجولاں

اک دام ہے خامشی، سراسر — ہے مرغِ کلام جس میں مضطر

ظلمات، قفس ہے، روشنی کا — اور سایہ ہے صید چاندنی کا

ہو طیرِ سخن مزارِ عنقا — کب فکر کے دام سے ہے بچتا

ہے دَورِ حیات ایک زنداں

ہیں جس میں تمام پا بجولاں

اورینٹل کانفرنس کا دوسرا اجلاس

بمقام کلکتہ (سنہ ۱۹۲۲ء)

(از مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو)

علمی اور تعلیمی تحریکات میں ہم سراسر یورپ کے محتاج ہیں اور ابھی ایک زمانہ تک ہمیں اس کی شاگردی کرنی پڑے گی۔ اُن کے علوم اور ایجادات ہی میں نہیں بلکہ اپنے علوم اور السنہ کی تحقیق میں بھی۔ چنانچہ اورینٹل کانفرنس جس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں ماہ فروری کے آخری ہفتے میں ہوا اسی شاگردی کا نتیجہ ہے۔

سب سے اوّل یورپ میں مستشرقین کی انٹرنیشنل کانگرس پیرس میں سنہ ۱۸۷۳ء میں منعقد ہوئی۔ دوسری سال اسی کانگرس کا اجلاس لندن میں ہوا۔ اس میں ہندوستان کی طرف سے مسٹر شنکر پانڈورنگ آنجہانی شریک تھے۔ اس کے بعد اس کانگرس کے مختلف مقامات میں کئی اجلاس ہوئے۔ لیکن کوپن ہیگن کے اجلاس میں پروفیسر میکڈانل (اکسفورڈ) نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ اس کانگرس کا اجلاس کلکتہ میں کیا جائے۔ لیکن بعض وجوہ سے یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ اس کے بعد پروفیسر میکڈانل نے یہ کوشش کی کہ کم سے کم ہندوستانی شعبہ کا اجلاس کلکتہ میں کیا جائے۔ لیکن ہندوستان کی طرف سے کچھ حوصلہ افزائی نہ ہوئی اور یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں فرانس کی زیر سرپرستی "پہلی اورینٹل انٹرنیشنل کانگرس" کا انعقاد ہنوئی (ٹونکن) میں ہوا اور اس میں ہندوستان، چین، جاپان اور ہندوستان بعیدہ کے شعبے بھی تھے ہندوستان کے ارکان کی تعداد اس میں بہت ہی کم تھی لیکن اس کانگرس کی کارروائی علم و تحقیق کی نظر سے بہت کامیاب خیال کی گئی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں سر ہارکورٹ بٹلر نے ہندوستان کے مستشرقین کی ایک مجلس شملہ میں منعقد کی جس میں بہت سے دلچسپ مباحث پر گفت گو ہوئی۔ اسی مجلس میں پروفیسر وگل نے ہندوستان میں "اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" اور اورینٹل کانگرس قائم کرنے کی مفصل اور مدلل تجویز پیش کی۔

اِن مباحث کا نتیجہ سمجھیے یا اُن مستعد طالبانِ علم کی ہمت اور شوق کا ثمرہ جنہوں نے ہندوستان کے نامور محقق اور فاضل سر رام کرشن بھنڈارکر کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا کہ یہ تجویز جس کی ایک مدت سے کھچڑی پک رہی تھی عمل میں آئی۔ اور چند علم پرور قدردان اصحاب کی امداد سے (جن میں سر داراب تاتا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے) پونا میں "بھنڈارکر ری سرچ انسٹی ٹیوٹ" کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۸ء میں اس انسٹی ٹیوٹ کی مجلس انتظامی نے اورنٹیل کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ مختلف اہل علم مستشرقین سے صلاح و مشورہ کیا گیا سب نے اس خیال کو پسند کیا۔ آخر نومبر ۱۹۱۹ء میں اس کانفرنس کا پہلا اجلاس پونا میں منعقد ہوا۔ مختلف صوبجات کی گورنمنٹوں اور بعض دیسی ریاستوں نے رقمی امداد کی یہ اجلاس تین روز تک رہا، اور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اس کامیابی نے منتظمین کا حوصلہ بڑھایا اور اس سال کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر اس کا اجلاس یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا۔

اس اجلاس کے صدر فرانس کے نامور سنسکرت کے عالم اور محقق پروفیسر لیوی تھے۔ افتتاح کی رسم بنگال کے گورنر نے ادا کی اور مجلس استقبالیہ کے صدر فخر بنگال سر آشوتوش مکرجی تھے۔

لارڈ رانلڈشے گورنر بنگال کا افتتاحی خطبہ موقع کے مناسب تھا اور اہل مجلس نے شوق سے سنا۔ لاٹ صاحب کے تیور دیکھ کر (بادشس بخیر) لارڈ کرزن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ نے کانفرنس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا گزشتہ مٹے ہوئے نقوش کے سراغ لگانے اور قدیم تہذیب و تمدن کے نشانات ڈھونڈھنے اور تحقیق کرنے سے صرف یہی غرض ہے کہ ہم اپنے شوق کو پورا کریں یا قومی تفاخر اور خود پسندی کے مزے لیں؟ نہیں، بلکہ اصل مقصد اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اہل ہند کی دماغی نشو و نما طبعی رجحان و اصول پر ہو تاکہ وہ بنی نوع انسان کی ترقی و اصلاح میں ممتاز حصہ لے سکیں۔ اسی تقریر میں اُنھوں نے اہل مشرق اور اہل مغرب کے فطرتی رجحانات کا بھی مقابلہ کیا اور کہا کہ مغرب کا خاص فطرتی رجحان نیچرل سائنس کی جانب ہے اور مشرق کا فلسفہ و ادب کی طرف۔ مشرقی دماغ سایہ کی اوجھل اصل شئے اور ظاہر کے پردے کے پیچھے حقیقت کی تلاش میں رہتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ حالات و ضروریات نے مشرق و مغرب میں یہ امتیاز پیدا کر دیا تھا اور اب بھی جغرافی و تمدنی حالات کی وجہ سے ایک حد تک یہ امتیاز باقی ہے لیکن موجودہ زمانہ کی عالمگیر دستبرد نے حالات اور ضروریات میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اس لئے طبعی رجحانات بھی اُسی کے ساتھ تھوڑے تھوڑے بدل رہے ہیں۔ نہ وہ مشرق مشرق ہے

اور نہ وہ مغرب مغرب۔ دونوں کی حالت بدل رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف جھک رہے ہیں اور دونوں اپنی اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ مشرق کے توہمات، تخیلات اور اعتقادات مغرب میں نشو و نما ہو رہے ہیں اور مغرب کی مادی ایجادات و اختراعات اور طریقۂ فکر مشرق میں گھر کر رہا ہے۔

کانفرنس اپنے صدر کے انتخاب میں قابل مبارکباد ہے۔ پروفیسر سلوین لیوی زندہ لوگوں میں سنسکرت کا سب سے بڑا عالم اور محقق ہے۔ لارڈ رانلڈشے اور پروفیسر لیوی کو یک جا بیٹھے دیکھ کر عجیب عجیب خیالات دل میں آتے تھے دو انسانی تصویریں تھیں مگر ایک دوسرے سے متضاد جس قدر ایک منکسر اور سراپا فروتنی تھا اسی قدر دوسرا مغرور اور اینٹھا ہوا نظر آتا تھا جس قدر ایک کو علم نے جھکا رکھا تھا، اسی قدر دوسرے کو حکومت نے گردن فراز بنا رکھا تھا۔ انسانی فطرت کا علم حاصل کرنے کے لئے دونوں قابل مطالعہ تھے۔ فاضل پروفیسر کا خطبۂ صدارت بلاشبہ عالمانہ اور محققانہ ہوگا۔ یہ رائے حسن ظن کی بنا پر ہے۔ کیونکہ جو کچھ انہوں نے پڑھا وہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ تھی تو انگریزی مگر فرانسیسی لہجہ میں۔ بس یہ سمجھ لیجئے جیسے کوئی ٹھیٹ انگریز اردو میں تقریر کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انگریزی کے کرخت اور کریہہ الفاظ ایک نازک زبان فرانسیسی سے کیوں کر ادا ہو سکتے تھے۔ منتظمین کانفرنس کا فرض تھا کہ پہلے دن کے تینوں خطبے اور خاص کر فاضل صدر کا خطبہ پہلے سے چھپوا کر اہل مجلس کو تقسیم کر دیتے۔ ایک ایسے بڑے مجمع میں اس سے بڑی سہولت ہوتی ہے۔

سر آشوتوش مکرجی جو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، دھوتی باندھے، ننگے سر، سفید شال اوڑھے اسٹیج پر اس طرح آ کھڑے ہوئے جیسے اندر کی سبھا میں دیو۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت بنگال میں علم کا دیوتا (گنیش کا اوتار) سر آشوتوش ہی ہیں۔ ان کے احسانات سے بنگال کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ یہ سر آشوتوش ہی کا طفیل ہے کہ آج کلکتہ یونیورسٹی ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اعلیٰ اور افضل ہے۔ جہاں اس نے علمی تحقیق و تنقید کی ایسی بنیاد ڈال دی ہے کہ آئندہ اس کے گراں قدر نتائج سے اس یونیورسٹی کو علمی دنیا میں خاص امتیاز حاصل ہوگا۔ ان کا خطبہ بہت لمبا چوڑا تھا۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں ان تمام علماء کے نام گنوائے جنھوں نے سنسکرت اور اس کے متعلقہ السنہ و علوم میں قابل قدر کام کئے ہیں شاید سوائے پروفیسر لیوی کے (جو اس وقت سنسکرت کا سب سے بڑا عالم ہے) چھوٹے سے چھوٹے عالم کا بھی ذکر آ گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب لوگ (اور پروفیسر لیوی بھی) قابل قدر ہیں اور ان کی کوششوں کا ذکر کرنا اور ان کا احسان ماننا فرض تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ سر آشوتوش جیسے وسیع النظر عالم سے ایک بہت بڑی فروگذاشت ہوئی کہ انھوں نے ان علما و محققین

ہیں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہیں کیا جنھوں نے اپنی تمام عمر سامی زبانوں کی تحقیق میں صرف کی ہے اور بنی نوع انسان کے علم میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ غالباً یا تو وہ یہ بھول گئے کہ یہ "اورینٹل" کانفرنس ہے اور اسے ہندو کانفرنس سمجھنے لگے یا وہ ایسے شدید محب وطن ہیں کہ ہندوستان کے کارناموں کے سوا کسی دوسری بات کا سننا گوارا نہیں کرتے۔ بہرحال اُن کے خطبے پر یہ جائز اعتراض ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

یہ پہلے دن کی کارروائی تھی۔ دوسرے روز سے ہر شعبے کی الگ الگ مجلسیں قرار پائیں اور جس کو جس شعبے سے دلچسپی تھی اس میں شریک ہوا۔ شعبے مفصلۂ ذیل تھے۔

۱۔ شعبۂ وید
۲۔ ایرانی
۳۔ بدھ مذہب
۴۔ لسانیات
۵۔ عربی فارسی
۶۔ فلسفہ و مذہب
۷۔ سیاسی تاریخ
۸۔ معاشرتی و مذہبی تاریخ
۹۔ قدیم جغرافیہ
۱۰۔ سنسکرت و پراکرت
۱۱۔ آثار قدیمہ
۱۲۔ سائنس
۱۳۔ علم الاقوام

سب سے زیادہ مضامین شعبۂ آثار قدیمہ میں تھے اور اسی شعبہ میں سب سے زیادہ چہل پہل اور رونق تھی۔ اور اس کے قہقہوں کی آواز دور دور تک پہنچتی تھی۔ کم سے کم اس سے ہماری قدامت پرستی کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔

سب سے کمتر اور کہتر شعبہ عربی فارسی کا تھا۔ اس کی بیکسی اور کس مپرسی کا پرسانِ حال سوائے حسرت کے کوئی نہ تھا اول تو مضامین ہی گنتی کی چار یا پانچ تھے اور وہ بھی ہیچ و پوچ۔ ایک صاحب (مسٹر آر۔ این۔ سہا) کو اُپج کی سوجھی اور انہوں نے قرآنِ پاک سے امریکہ کا وجود ثابت کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سوامی دیانند سرسوتی کی روح اُن میں حلول کر آئی ہے بہرحال اس سے حاضرین کی تفریح طبع کا سامان ہو گیا۔ ہمیں منتظمین و بانیان کانفرنس سے اُمید ہے کہ وہ آئندہ اجلاسوں میں اس شعبہ کی طرف خاص توجہ فرمائیں گے۔ اگرچہ اس شعبہ کی بے رونقی کا الزام ایک حد تک کارکنانِ کانفرنس پر ہے لیکن وہ حضرات بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے جو عربی و فارسی میں تبحر رکھتے ہیں مگر اس طرف توجہ نہیں کرتے

ایک وجہ اور بھی ہے کہ اکثر عربی و فارسی کے علماء ایسے ہیں جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو اپنے مطالب کو اس زبان میں بے تکلفی سے ادا نہیں کر سکتے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس شعبہ کے لئے (یا جہاں کوئی اور ضرورت ہو) انگریزی زبان کی قید اٹھا دی جائے۔ شائع کرنے کی غرض سے اُن کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔

دوسری ایک فروگزاشت یہ نظر آتی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ اور زندہ زبانوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی۔ اس کا شعبہ بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ اگرچہ یہ قدامت پرستی کی شان کے خلاف ہے لیکن یہ نہ بھول جانا چاہیئے کہ حال میں ماضی مضمر ہے۔

غرض اس کانفرنس کا اجلاس ۲۸ جنوری سے ۲ فروری تک مسلسل رہا ان ایام میں زندہ دل اہل کلکتہ نے اپنے مہمانوں کی تفریح کے لئے طرح طرح کے سامان بہم پہنچائے اور نہایت فیاضی اور سیر چشمی سے خاطر تواضع اور مدارات کی۔ اِن تفریحات میں سے چند قابل ذکر ہیں۔ ۲۸ جنوری کو نہرو خاندان کے بزرگ رائے منی لال صاحب بہادر نے اپنے اور اپنے بزرگوں کے جمع کی ہوئی قدیم قلمی تصاویر اور صناعیوں کی سیر کرائی۔ اور سب کی چاء پان وغیرہ سے تواضع کی۔ ان کے خاندان کا ایک ایک شخص مہمانوں کی خاطر تواضع میں بچھا جاتا تھا۔ ۲۹ جنوری کو ایک اسٹیمر دریا کی سیر کے لئے مہمانوں کے واسطے مخصوص کیا گیا۔ اور چاندپال گھاٹ سے رائل بوٹنیکل گارڈن تک لے گئے۔ باغ کی سیر کے بعد پھر اُسی اسٹیمر میں واپس ہوئے۔ آتے جاتے اسٹیمر پر چاء پان انگریزی اور دیسی مٹھائی وغیرہ سے تواضع ہوئی۔ ۳۰ جنوری کو رات کے وقت لاٹ صاحب نے اپنے ہاں مہمانوں کو بلایا۔ خاطر مدارات کے بعد ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کا ڈراما (پوسٹ آفس) دکھایا۔ ۳۱ جنوری کو یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال میں چاء وغیرہ کے بعد ہندوستانی گانا سنایا گیا۔ اس کے لئے نامور گویّے بلائے گئے تھے۔ یہ جلسہ بڑے تفریح کا تھا۔ پروفیسر لیوی نے جوش میں آکر پروفیسر فدا حسین خاں رامپوری سرود نوازکی داد دی اور کچھ نذر بھی کیا۔ اس کے بعد سنسکرت کے مشہور ڈراما مرچاکیٹیکا (مٹی کی گاڑی یعنی کھلونے کا) کا ایکٹ ہوا۔

بہرحال یہ چند روز بہت لطف کے ساتھ بسر ہوئے اور ارکانِ کانفرنس بنگالیوں کی زندہ دلی اور مہمان نوازی کا نقش دلوں پر لے کر آئے۔

اُردو کی قومیت

(از مولوی ندیم الحسن صاحب (رضوی موہانی)

یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ جتنی اور جس قسم کی کوششیں کسی مقصد میں کامیابی کے لئے سوچی جاتی ہیں خواہ وہ ظنی ہوں یا ادعائی، حقیقی ہوں یا خیالی، قولی ہوں یا عملی، اُن کے لئے ایک نہ ایک منتہیٰ اور مرکز ضرور ہونا چاہیئے اور یقیناً ہوتا ہی۔ بغیر تعین غایت کوئی کوشش کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی، یہ بھی لازمی ہے کہ ہر مرکز سعی کے اطراف میں ایک دائرۂ تدابیر، اصول اور ضوابط کا ہوا کرتا ہی اور جب تک وہ کوششیں ایک سلیقہ کے ساتھ اپنے منتہائے سعی کی طرف راجع رہتی ہیں، مختلف پہلوؤں سے باعتبار معیار مرکز اُن میں کامیابی ہوا کرتی ہی۔

کسی تحریک کو عملاً بار آور کرنے کے قدیم طریقے عموماً قلیل، کمزور اور دیر اثر ہوا کرتے تھے اور مذہب و رُوحانیات سے دوش بدوش، تاہم اُن کے آخری اثر اور رجعت الی المقصود کے سلسلہ کی کڑیاں کسی نہ کسی طرح کامیابیٔ مقصد سے دوچار کر دیتی تھیں مگر آج کل صرف قلت وکثرت اور کمزوری وقوت کے اصول پر عملی کامیابی یا ناکامی کا انحصار رہتا ہی، تحریریں، تقریریں، رسالے، اخبارات، جلسے، انجمنیں، مدرسے، کلبیں، کارخانے وغیرہ آج کل کے تعمیلی آلے ہیں جو کسی تحریک کو عملاً کثرت کے اصول پر کارآمد اور دیرپا بنانے کے لئے وجود میں آتے ہیں، اور ان میں جائز و ناجائز حق و ناحق کا مطلق امتیاز نہیں رکھا جاتا۔ قبل اس کے کہ اس تمہید کو مضمون مابعد سے جو بہ لحاظ اپنے موضوع کے بہت مختصر ہی اور عنوان سے جو بہت وسیع ہی مربوط کیا جائے یہ امر ملاحظہ طلب ہی کہ وہ قوتیں اور مخفی اثرات جو اقوام کے عروج و زوال میں مسلّمہ طور پر دخل رکھتی ہیں عموماً تین ہوا کرتی ہیں اوّل تو قوت فوجی (یا عسکریت) دوسرے، زبان کی طاقت اور عالمگیری، تیسرے مذہب و رُوحانیت کا تغیر و تخلیق، ان تینوں کے علاوہ مادی اعتبار سے کوئی چوتھی شے ایسی قرار نہیں دی جاسکتی جو "انقلاب امم" کے نظریہ کی کلیتاً معیار ٹھہر سکے، رہ گئے دیگر احساسات مثلاً سیاست، حریت، انقلاب پسندی، قومی ہمیت وغیرہ وغیرہ یہ سب

فریعین ہیں اور اصولاً انھیں اصول ثلاثہ کے تحت میں آتے ہیں تاوقتیکہ ذاتی حفاظت واطمنان کے لئے فوج اور اسلحہ کی قوت نہو کوئی قوم تنازع للبقا کے منازل نہیں طے کرسکتی اور اُس کی حیات ملی کے قیام وبقا کا کوئی تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ بغیر فوجی قوت اور حربی عصبیت کے ہر قسم کے قومی خیالات واحساسات و مظاہرات وغیرہ قطعاً فضول ہیں اور پرکاہ کی برابر بھی وقعت دوسری برسرقوت اقوام کی نگاہ میں نہیں رکھتے، ان کو مُردہ احساسات سمجھنا چاہیئے۔ البتہ جس طرح ایک دیوانہ سے ہوش میں آنے کے بعد انسانی حرکتوں کی توقع ہو سکتی ہی بعینہٖ اسی طرح فوجی حرارت پیدا ہو جانے کے بعد یہ خیالات خود بخود قوت سے فعل میں آنے لگتے ہیں اور شخصی وقومی خود داری کا جذبہ نہایت جوش کے ساتھ صورت پذیر ہونے لگتا ہی۔ اس قوت کی عدم موجودگی میں قومی احساسات کی نمایش بیکار ہونے کے علاوہ ان کی وقعت حقیقی کو زائل کرتا ہی۔

دوسری قوت جو نفس مبحث ہی اور جس کی نسبت حتماً کہا جا سکتا ہی کہ بنیاد قومیت وسیاست ہی، زبان ہے اس کے ضمن میں بہ لحاظ ترقی وتنزل اقوام قومی تاریخ اور ادب وشاعری وغیرہ رکھی جا سکتی ہی اور اب تو علم سیاست بھی خزانہ زبان کا ایک جزو ہو گیا ہی اور قدرتاً ہونا چاہیئے، مگر زبان کی قوت اور تاثیر کا اصلی محور تاریخ اور ادب ہی اور اس کے آگے سیاست اور دیگر علوم بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں جن کی تفصیل آگے آتی ہی۔

تیسری قوت روحانیت ہی جس کے ذیل میں مذہب نیز انبیا علیہم السلام واولیا وغیرہ کا ارتقائے روحی شمار کئے جاتے ہیں مختصراً معجزہ اور کرامت اس قوت کے حاصل ہیں اور یہیں سے اس کی قوت آیندہ ایک قومی صورت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہی اگرچہ بدقسمتی سے بہت کم ایسا ہوا ہی کہ نظام روحانیت ایک اجتماعی حیثیت سے غلبہ قومیت کے لئے استعمال میں لایا گیا ہو بلکہ اس کے عام اور وسیع اثرات صرف انفرادی نفوذ وصفائی قلب تک محدود رہتے ہیں اور جہاں کہیں "زبان" اور "عسکریت" کو اس کی ضرورت ہوتی ہی صرف ضمناً ہوتی ہی خلاصہ یہ کہ روحانیت ہرچند کہ بہت قوی اور زود اثر ہوتی ہی مگر اپنے ابتدائی دوروں کو طے کرنے کے بعد اس کی مرکزیت بہت جلد اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہی اور اس کا نظام اجتماعی فوراً منتشر ہونے لگتا ہی کیوں کہ عام دسترس کو اُس تک رسائی نہیں۔

بہرکیف ان مذکورہ انقلابی عناصر ثلاثہ میں زبان کا مسئلہ اہم ترین ہی خصوصاً اُس وقت تو جب زمانہ جدید کے

لحاظ سے اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی جائے تو اور بھی زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ اس کے پراثر ہونے کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تینوں قوتوں کے وسط میں باعتبار تدریج اثرات یہ اپنا وجود رکھتی ہے یعنی فوجی قوت تو نہایت شورشانہ ہے اور زود اثر انقلاب اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے مگر اس کے پرشور ہنگامے مدت تک خود اس قوت کو اپنے حواسوں میں نہیں رکھتے اور ایک عرصہ تک کشت و خون اور اتلاف جان کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ اکثر بصورت عدم اہلیت اس کا منشا ہی فوت ہو جاتا ہے کیوں کہ اس شہزور گھوڑے کی باگیں جہاں چھوٹیں پھر کسی کا قابو نہیں کہ اس کو اپنے حسب منشا رکام میں لاوے مگر زبان کی تاثیر نسبتاً معتدل ہے اور اپنے اقدام میں سست و دیر عمل اور اس کے خاموش اور داخلی ہنگامۂ انقلاب میں ایسی غیر محسوس مگر حقیقی قوت ہوتی ہے کہ بے اثر کئے رہتی ہی نہیں اور اس قوت و اثر کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار بالکل حسب منشا رہتی ہے اور جس رنگ میں چاہیں نمودار ہو سکتی ہے اور روحانیت کا درجہ اس کے بعد ہے کہ اس میں بے حد جد وجہد کرنا پڑتی ہے اور تاریخ میں اس کی انقلابی مثالیں بہت کم ملیں گی گو یہ ضرور ہے کہ کہ ان دونوں قوتوں کا دیر اثر ہونا ہی ان کے پائدار اور قوی الاثر ہونے کا بڑا زبردست ثبوت ہے غرض یہ کہ زبان کی قوت انقلاب کا جتنا تعلق عنصر اوّل سے ہے اُتنا ہی عنصر ثالث سے اور وہ قوم قطعاً ترقی سے نابلد ہے جس نے اپنی زبان کو مُردہ کر لیا اور مختلف اعتبارات سے کماحقہا اُس سے پورا پورا فائدہ نہ اُٹھایا۔

زبان کی انقلابی اور روبہ ترقی تاثیر سے اغماض کرنا بدیہیات کا منکر ہونا ہے۔ زبان اور قوم کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور زبان کا زوال و فنا یقینی مترادف ہے قوم اور اہلِ زبان کے ادبار و زوال کا۔ اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ زبان اپنی قوم سے یا قوم اپنی زبان سے علٰحدہ ہو اور علٰحدہ ہو کر بھی اپنی ہستی قایم رکھ سکے۔ جو زبان کہ قومیت سے بے بہرہ ہے اور وہ قوم جس کی کوئی قومی زبان نہیں ہے یقیناً زوال پذیر ہے قوم اور زبان کا تعلق رُوح اور جسم کا ہے کہ ایک کے اعدام سے دوسرے کا وجود قایم ہی نہیں رہ سکتا کسی قوم کے لئے لسان القوم کا ہونا گویا قومی نطق کا ہونا ہے جس کے بغیر ایک قوم بالکل گونگی ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ اقوام میں نسل، رنگ، تمدن وطن وغیرہ بنیاد قومیت سمجھی جاتی ہیں اور ان امور کا زوال یا ان کی توہین بالکل قومی ادبار یا توہین کے برابر سمجھی جاتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان تمام خصوصیات میں مشترک اور ناگزیر عنصر "زبان" بھی ہے جس نے ان تمام باتوں

ہیں جان ڈال دی ہی اور کچھ ان اقوام ہی پر منحصر نہیں ہی بلکہ اصولاً کسی فرقہ کی قومیت اُس وقت تک کبھی متعین و مخصوص نہیں ہوسکتی جب تک اُس کی ذاتی کوئی زبان نہیں ہی جس میں قومی خصوصیات جھلکتے ہوں۔

زبان کی قوّت کا بہت قوی سبب اور ثبوت بالعکس یہ بھی ہی کہ ابتدائی تاریخ سے فاتحین ہمیشہ مفتوحین کی زبان یعنی اُن کی قومیت و تمدّن کو برباد کرنا فوجی استیلا سے دوسرے درجہ پر جانتے ہیں کیوں کہ اس سے منجملہ دیگر فوائد کے دو بہت بڑے اور اصولی فائدے حاصل ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ فاتحین کی زبان مفتوحین کی زبان کی جگہ لے لیتی ہی دوسرے یہ کہ مفتوحین کی زبان یا قومیت بالکل مُردہ ہوجاتی ہی اور اگر قدرت اس میں کسی قسم کا بخل کرتی ہی تو جدید مصنوعی طریقوں سے اس تغیر زبان کو نہایت حاوی اور پُراثر بنا دیا جاتا ہے۔ یونانی اور رومی زبانوں نے غیر اقوام پر اپنا تسلط اور اپنی پائدار حکومت صرف اپنی قومیت کی بنا پر جمائی اور پھر اہلِ عرب نے اپنی زبان کے ہاتھوں جو زبردست اور اسلامی اثر مدّتوں تک تمام ایشیا و یورپ پر بالواسطہ اور بلا واسطہ ڈالے رکھا وہ اظہر من الشمس ہی۔ اور جو اثر اس زبان نے دکھایا وہ ہرگز فوج سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ زبان کے غیر محسوس اور خاموش اسلحہ فوج کے خارا شگاف اور ہنگامہ زا اسلحہ سے کہیں زیادہ مار رکھتے ہیں۔

پس زبان کو نہایت بجا طور پر قومی تعین و تشخص کا مرکز کہا جا سکتا ہی جس کے اطراف میں مختلف قسم کی ترقیوں کا دائرہ ہی اور جب تک ایک قوم کثرت سے اپنی زبان کو مرکز قرار دے کر اپنی تمام کوششوں کو اس ایک نقطہ پر جمع نہ کرے گی کبھی قومی رُوح اپنے میں پیدا نہیں کر سکتی اور نہ دیگر اقوام کے مقابلہ میں جہد حیات کو کامیابی سے اختتام تک پہونچا سکتی ہی۔ اور ہر قومی تحریک کے لئے ضروری ہی کہ پر اثر ہونے کے لئے زبان کو اپنا پشت پناہ قرار دے لے اور یہی بیان تمہید مضمون میں ادا گیا گیا ہی۔ ہندوستان بھی اک ملک ہی جس کی قدامت اور تہذیب اور تمدن تواریخ عالم میں بے نظیر تسلیم کئے جا چکے ہیں اور اس قدیم تہذیب و تمدن کے ساتھ یہ لازمی تھا کہ کوئی قومی زبان بھی ہوتی چنانچہ تھی اور نہ صرف تھی بلکہ اُس کا ادب بھی نہایت اعلیٰ درجہ پر پہونچا ہوا تھا سنسکرت کی ادبی لطافتیں اور باریکیاں اور پراکرت کی معاشرتی وسعت اور خوبیاں محتاج بیان نہیں ہیں جیسا کہ تمام مؤرخین نے لکھا ہی قدیم تہذیبیں عموماً تمامتر مذہبی ہوتی تھیں مذہب ہی اُن کا

اوڑھنا بچھونا تھا زبان بھی اس مذہبی تمدن سے غیر متاثر نہ رہ سکی حتیٰ کہ سنسکرت علاوہ ادبی نزاکتوں کے تقدیس کا جوہر بھی رکھتی تھی اور یہ اسی تقدیس و قدامت کا نتیجہ ہے کہ باوجود نہایت شدید خارجی حملوں کے وہ اب تک اپنی حقیقی خصوصیات کے ساتھ باقی ہے۔

بہرحال ایک ایسے ملک کے لئے یہ نہایت شرمناک امر ہے کہ اس کی کوئی قومی زبان ہی نہ ہو۔ ہندوستان کے لئے اب تک کوئی قومی ہندوستانی زبان مخصوص نہیں کوئی ایسی عام زبان نہیں جس میں خاص ہندی قومیت جھلکتی ہو اور جس کو تمام قومی ترقیوں کا مرکز واحد قرار دیا جا سکے۔ بجز اس کے کہ یہ کہا جائے کہ اتنے وسیع ملک میں یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی زبان ہی نہ ہو اور قدرت کا ہاتھ کسی ایک زبان کو عام قومی زبان تک پہونچا دینے میں قاصر رہا ہو البتہ یہ اک امر دیگر ہے کہ جب کوئی متحدہ قومیت اور متحدہ تاریخ ہی نہیں موجود ہے تو قومی زبان از خود کیوں کر وجود میں آسکتی ہے۔

مجبوراً موجودہ زبانوں ہی میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ علم اللسان کی رو سے ہندوستان کی موجودہ زبانوں میں سے کونسی زبان قومیت کے معیار پر ٹھیک اترتی ہے۔

کسی زبان کی قومیت کا معیار اس کی وسعت و کثرت پر موقوف و منحصر ہے بحیثیت قوت اخذ و اتحاد کے بحیثیت جذب و انجذاب کے بحیثیت استقاق و مادہ کے بحیثیت رسم الخط کے وغیرہ۔

دوسرے زبان کی قومیت کا معیار اس کی ادبیت اور قابلیت پر ہے جس قدر اس میں ادبی ذایقہ اور علمی رنگ زیادہ نمایاں ہوگا، جتنی اس میں اصطلاحات کی کثرت اور مضامین کا تنوع ہوگا اور جتنے زیادہ اس میں استحالہ اور مادیت کے اثرات پائے جائیں گے اور ہر قسم کے خیال اور باریکی کو ادا کرنا بسہولت ممکن ہو سکے گا اسی قدر اور اسی لحاظ سے اس زبان کی قومیت کا تعین بہ آسانی کیا جا سکے گا۔

ہندوستان میں کیا بلحاظ وسعت و کثرت اور کیا بہ اعتبار علمیت و ادبیت کون زبان قومی معیار پر ٹھیک اتر سکتی ہے اور کس زبان کے ذریعہ سے اس ملک کی قومی اور مادی ضرورتیں رفع ہو سکتی ہیں؟ اس سوال کا جواب اگر داخلی حیثیت سے دیا جائیگا اور ہندوستان کے اندر ہی تلاش کیا جائیگا تو فوراً وہی جھگڑے بکھیڑے

اُٹھ کھڑے ہوں گے جو ہندوستان کی غلامی اور فرقہ بندی کی پالیسی کے لحاظ سے ضروری ہیں اور ان سے بچنے کی کوشش کرنا بالکل فضول ہے۔ پس سب سے بہتر طریق کار یہ ہوگا کہ مذکورہ سوال کا جواب بجائے ہندوستان کے ایشیا میں تلاش کریں اور فی الحقیقت جو شخص اس سوال کا ایک معقول حل پیدا کرنا چاہے اُسے بغیر ہندوستان کے باہر نظر دوڑائے ہوئے کوئی صورت تصفیہ کی معلوم نہ ہوگی اُردو اور ہندی کے فساد کی اصلی بنا یہی معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے حامی ہندوستان کے باہر جانا نہیں چاہتے اور ہندی کے مقابلہ میں ترجیح کے جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ ہندی کے تموّل کے آگے اگر ہیچ و پوچ نہیں تو کم از کم ایک مساویانہ حقوق کا معاملہ ضرور پیش کر دیتے ہیں حالاں کہ علم اللسان اور فلسفہ لسانیہ کے رو سے جو خصوصیتیں اُردو کو حاصل ہیں اور جتنی زرخیزی اور ترقی کی نشانیاں اور ایک قومیت کی علامتیں اس میں جھلکتی ہیں ہندی تو کیا ایشیا بلکہ یورپ کی بھی کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں اور جیسا کہ ہم نے الترجمہ میں لکھا ہے اگر آج اُردو زبان بجائے معاشرتی زبان ہونے کے کوئی جنگی زبان ہوتی اور اس کو کوئی حربی سرپرستی نصیب ہوئی ہوتی تو جس جگہ پر آج انگریزی زبان ہے وہ مقام مع شئے زاید اُردو کا ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے اُردو معاشرتی اور اخلاقی گودوں میں پلی بڑھی اور مجلسی دلچسپیوں تک محدود رہی اور اس وجہ سے ہنوز عالم طفلی میں ہے بریں ہم علوم جدیدہ کے میدان میں جیسے لمبے لمبے قدم اُس نے مارنا شروع کئے ہیں وہ ظاہر ہے اور وہ دن انشاء اللہ دُور نہیں کہ وہ اپنی قدیم تاریخی وسعت اور ہر دلعزیزی کے لحاظ سے اخلاقی حدود کو چھوڑ کر مادیات میں دخل دے اور رفتہ رفتہ اُن چیزوں کو اُردو میں ملبوس کر دے جن کو دوسری زبانیں ملچھ سمجھتی ہیں۔

بہ لحاظ تعداد حروف اور تکملہ اصوات کے اُردو کس قدر مکمل ہے کیا اس کے مقابلہ میں قطع نظر ہندوستانی زبانوں کے ایشیا یا یورپ کی کوئی زبان پیش کیجا سکتی ہے حالاں کہ یہ بہت معمولی بات ہے مگر تعمیر زبان کا بنیادی پتھر یہی ہے۔

بہ اعتبار تعدد الفاظ و تنوع اصطلاحات کے اُردو زبان کس قدر ہمہ رس اور ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ اُس کا دامن لغات کتنا وسیع ہے، اُس کا اخلاق لسانی کیسا فراخ ہے۔ اس پہلو سے بجز چند مادی زبانوں کے اور کون زبان اُس کا مقابلہ کر سکتی ہے:۔

رسم الخط اُردو کا ایسا جامع اور مانع ہے کہ فلسفہ لسانیہ کی رو سے ہر زبان اور ہر قسم کے علوم بہ آسانی اس میں زینت بخش ہو سکتے ہیں اور در اصل رسم الخط ہی نے اس کو وہ عظیم الشان حیثیت دے رکھی ہی کہ بعض مخالفین اُردو اس کو ایک خالص اسلامی زبان سمجھ بیٹھے ہیں حالاں کہ واقعتاً ایسا نہیں ہی البتہ یہ ضرور ہی کہ رسم الخط نے اس کے دائرہ اثر کو بہت وسیع کر دیا ہی اور نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہی جس کو حضرت اُردو اپنے سے مانوس ہونے کا صلائے عام نہ دے سکیں زبانی برادری میں اُس کے ہر دلعزیز ہونے کا باعث کثرت حروف اور رسم خط ہی چنانچہ ہر زبان کے الفاظ بہ آسانی اُردو میں ڈھالے جا سکتے ہیں اور کسی زبان کو اُردو سے وحشت اور تعصب کی کوئی وجہ نہیں، کیا کوئی اور زبان بھی اس قدر زبان آفرین اور وسیع الاخلاق اُردو کے مقابلہ میں لائی جا سکتی ہی ؟ اس کا جواب زمانہ دے رہا ہی۔

پس کثرت حروف تکملہ اصوات مختلفہ، تنوع اصطلاحات، رسم الخط وغیرہ اعلیٰ صفات لسانیہ نے نہ صرف اس امر کا فیصلہ کر دیا ہی کہ اُردو قطعاً ایک نہایت پر اثر قومی زبان بننے کی اہلیت و قوت رکھتی ہی بلکہ ضمناً یہ بھی ثابت کر دیا کہ اگر اس نے مادی حیثیت سے ترقی کی تو نہایت آسانی سے تمام ایشیا پر چھا جائے گی. کیوں کہ یہ صرف عربی۔ فارسی اور ترکی و پشتو کا طفیل ہی کہ اُردو ہر قسم کی ادبی اور علمی زرخیزی سے بھری ہوئی ہی اور یہ فیض قدرت کی طرف سے شاید اُردو ہی کو عطا ہوا ہی کہ یہ زبان بھی بعینہٖ جس طرح ایک صحیح جسم انسانی اپنی نشو و نمو میں بتدریج ترقی کرتا ہوا اپنے تمام قوار کی تکمیل کر لیتا ہی اور اُس وقت فطرت کی تخلیق و ترتیب کا منشا پورا ہوتا ہی، بالکل اسی طرح کے تدریجی ارتقاء کے علامات یہ زبان ظاہر کر رہی ہے۔ اُس کی رگ رگ میں فارسی و عربی کا رنگ بھرا ہوا ہی مگر موجودہ دور مادیت میں اُس پر یہ الزام آ سکتا تھا کہ مشرقی ادب و فلسفہ ایک فرسودہ مبحث سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہر چند یہ الزام کوتاہ بینی پر مبنی ہو، تاہم اُردو نے جس طرح آغوش شوق کھول کر انگریزی اور دیگر زبانوں کو لپٹا لیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ گویا مغربی ادب و فلسفہ اور مغربی خیالات اسی لئے یہاں آئے تھے کہ اُردو میں جذب ہو جائیں اگرچہ مشرقی اور مغربی زبانیں بجز چند مستثنیات کے ایک ہی ماں کی بیٹیاں اور بچھڑی ہوئی اولادیں ہیں پھر بھی ہندوستان کی دوسری

زبانیں جو بمقابلہ اُردو کے کہیں زیادہ قدیم، مضبوط، اور ادبی تھیں بسبب اپنی تنگ خیالی اور تعصب کے اپنی دُور اُفتادہ بہن سے جو یورپ سے آئی ایسی بھڑکیں اور بدکیں کہ اُس نے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ اُردو کی اخلاقی وسعت سے فائدہ اُٹھائے اور اُردو بھی مغربی مادیت سے اس قدر مانوس ثابت ہوئی کہ گویا یہ مادیت ایک بھولا ہوا سبق تھا جو اُردو کو بغیر کسی قسم کی جدوجہد اور تنازع کے مغرب کی سب سے بڑی زبان نے اپنے ترقی یافتہ اور نئے انداز میں پھر یاد دلا دیا۔ اور اُردو نے انگریزی الفاظ، اصطلاحات، طرز ادا، آہنگ تخیل وغیرہ کو اس مستعدی سے قبول کر لیا کہ دونوں میں سے کسی کو ذرا بھی زحمت نہ ہوئی۔

یوروپ کے جدید فلسفہ توریث کے لحاظ سے اس اُردو انگریزی بلکہ مشرقی و مغربی آمیزش میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ السنہ سامیہ جن کی اُردو رہینِ وجود ہے ام الالسنۂ آریہ" کے وسیع خاندان سے بالکل الگ ہیں اور ان کے تخیل اور ادب میں ایک دوسرا ہی خون دَوڑ رہا ہے بحالیکہ فرانسیسی انگریزی پرتگیزی اور دوسری مغربی زبانیں آریہ خاندان سے ہیں پس جس طرح امرود میں سیب کا قلم اور مختلف پہلوؤں میں اسی قسم کے پیوند علاوہ ایک جدید ذائقہ کے پہلوؤں کے استحکام اور وسعت کا سبب ہوتے ہیں اور جس طرح دو مختلف صحیح الجسم خاندان آپس میں رشتہ کر کے علاوہ استحکام ذات کے ایک قوی اور نئی نسل کے وجود میں لانے کا باعث ہوتے ہیں اسی طرح وسیع اور قوی سامی زبانیں جب بذریعہ اردو کے آریہ زبانوں کے ساتھ شیر و شکر ہوئیں اور دونوں کے تخیل، ادب اور لسانیت وغیرہ نے باہم رد و اخذ اور تغیر و تبادلہ کا عمل جاری کیا تو اُس کا نتیجہ اس صورت میں نکلا ہے جو موجودہ اُردو ظاہر کر رہی ہے۔ اور جس قدر زمانہ گزرتا جائیگا۔ اُردو کے لسانی جوہر برابر کھُلتے جائیں گے کیوں کہ اب تک اُردو میں جس قدر اور جس قسم کے تغیرات مختلف منازل میں ہوتے رہے اُن سے بجز اس کے کہ یہ نتیجہ نکالیں کہ اُردو ترقی کر رہی ہے اور پورے جوش استقلال اور حوصلہ کے ساتھ زمانہ کا ساتھ دے رہی ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اخبارات، رسالے، کانفرنسیں، انجمنیں، علوم جدیدہ کے ترجمے۔ جدید اختراعات کے نتائج وغیرہ یہی چند چیزیں ہیں جنھوں نے اُردو کو مادیات سے روشناس کرایا ہے اور ایک نہایت ہی قلیل عرصہ میں اُردو نے جس کا بمقابلہ معاصر السنہ کے ہنوز عالم طفلی ہے مادیات کو اس طرح اپنا کر لیا کہ گویا وہ بنی ہی اس لئے تھی

صرف دس برس پیشتر کی اُردو اور آج کی اُردو سے اگر بہ لحاظ اصطلاحات، مضامین، لسانیت، ترویج و وسعت وغیرہ کے مقابلہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ آج کی اُردو بدرجہا قوی وسیع آزاد اور فصیح و بلیغ ہے اور یہی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ ہندوستان میں اگر کوئی زبان ایسی موجود ہے جو قومی ضروریات کو پورا کر سکے اور قومی معیار پر ٹھیک اتر سکے تو وہ صرف اُردو ہو سکتی ہے۔

عصر موجودہ نہایت تیزی کے ساتھ شاید مادیت کی طرف دواں ہے اور وہ زبانیں جو مادیت سے بیزار ہیں یقیناً مجہول، کمزور اور "غیر قومی" ہیں اور زمانہ کے ضروریات کے لئے بالکل ناکافی اس لئے کہ عہد حاضرہ میں شدّت مادیت کی وجہ سے مسابقت اس قدر سخت اور بقا و فوقیت کے واسطے تصادم ایسا شدید ہے کہ جو زبانیں علوم مادیہ سے بسبب اپنے افلاس اور تعصّب کے متمتع نہیں ہو سکتیں وہ سوائے اس کے کہ اپنی قوم کو قومیت کے درجہ سے رفتہ رفتہ گرا دیں اور کس کام آسکتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی بعض زبانیں خالص علمی ادبی یا مذہبی ہیں اور ان پہلوؤں سے ترقی کے ممکنہ مدارج طے کر کے پوری تکمیل کو پہونچی ہوئی ہیں مگر فی الحقیقت آج کل زبان کا مفہوم صرف اور صرف اُسی بولی میں پنہاں ہے جو مادی ہو یا مادی علوم کو اپنا بنا لینے کی اہلیت رکھتی ہو۔

موجودہ ایشیائی زبانوں میں صرف جاپانی زبان ایسی ہے کہ جس نے ایک قومی زبان کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا اور اس پر عمل کیا ہے، اس کے مقابلہ میں ایشیا کی کل زبانیں مُردہ ہیں کیوں کہ یہ یا تو مذہبی ہیں یا معاشرتی، حالاں کہ جاپان کی ترقی اور رفعت کا واحد سبب وہاں کی زبان کا قومی ہو جانا ہے گو اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جاپانی مذہب اور تمدن عملاً فنا ہو کر یورپ کی طرح دہریت و مادیت میں ضم ہو گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا تمدن اور اُس کی تہذیب اس قدر کہنہ اور بوسیدہ ہو چکے تھے کہ مادی تہذیب کی کشمکش کے مقابلہ میں قایم نہ رہ سکے اور ان پر بالکل مادی رنگ چڑھ گیا۔ اپنی تہذیب کو کھو کر اُس نے یہ فائدہ ضرور حاصل کیا کہ ایک نہایت ہی قلیل مدت میں حامیان مادیت کا مقابلہ کرنے لگا اور "مہذب" شمار ہونے لگا۔

مگر ہندوستان کی قومی زبان کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہے اس لئے کہ اس کی وسعت اور ایشیائی نوعیت نے اس کی بنیادیں ایسی مضبوط کر دی ہیں کہ داخلی حیثیت سے اس میں کوئی تغیر نہیں آسکتا اُردو زبان اگر

ایک طرف عربی و فارسی کی وساطت سے بے اندازہ حرارت حربی، روایات جنگی اور انقلابات سیاسی کی ذخائر قدیمہ سے مالا مال ہی تو دوسری طرف ہندو سُورماؤں کے لاثانی اور غیر فانی کارنامے اس کو قومی رُوح کے تمام منازل طے کرا چکے ہیں اب صرف اس پر ایک مادی رنگ چڑھنا باقی رہ گیا ہی مگر اس رنگ کے چڑھجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کی حقیقت بھی متغیر ہو جائے گی اور یہ واقعات و نتائج ایسے بدیہی ہیں کہ ان پر صرف خیال آرائی کا گمان ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اُردو کا ادب مستقل ہی رسم الخط ہر طرح سے مکمل ہی، لسانیت کافی و وافی ہی دائرہ وسیع ہی مختصر یہ کہ ایک قومیت کے لئے جو عناصر ضروری ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں پس خواہ ہندوستان تسلیم کرے یا نہ کرے ایک دن یہ ضرور یہاں کی قومی زبان ہوکر رہیگی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اعداد بھی یہی ثابت کرتے ہیں کہ لکھنے، بولنے، سمجھنے کے اعتبار سے اُردو زبان ہر قطعہ ملک میں روز بروز وسیع اور زیادہ دخیل ہوتی جاتی ہی۔

پس اب یہ مسئلہ کہ ہندوستان کی قومی زبان کیا ہونا چاہیئے بہت کم حل طلب رہجاتا ہی اور اگر ایک مرتبہ ترکیبی اصول سے یہ فرض کرلیں کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہوگئی یا ہندوستانی قومیت اُردو کے قبضہ میں چلی گئی۔ تو تحلیلی حیثیات سے فوراً یہ نظر آجائے گا کہ واقعی بتدریج ایسا ہی ہو رہا ہی۔ اس لئے کہ ہر قوم اپنے شرف ملکی اور امتیاز قومی کی غرض سے بزدلی پر جوانمردی کو، حرص پر ایثار کو، بے غیرتی پر حمیت کو بےحسی پر تاثر کو، جمود پر حرکت کو، جہالت پر علم کو، تاریکی پر روشنی کو، بدصورتی پر خوبصورتی کو، خلاصہ یہ کہ بُرائی پر اچھائی کو ہمیشہ ترجیح دیتی رہی اور دیتی رہیگی اور جس قوم نے حسد، تعصب اور تنگ خیالی کی بنا پر اس کے خلاف کیا اُس نے گویا طبع سلیم پر ذوق بے بضاعت کو اور حیات پر موت کو ترجیح دی اور سراسر جنوں کا ارتکاب کیا۔ لیکن اس موقع پر یہ حقیقت فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ ملکی و قومی امتیاز و شرف یعنی جوانمردی ایثار، حمیت، اثر، حرکت، علم، روشنی، خوبصورتی، طبع سلیم، اقبال، بیداری حتیٰ کہ حیات وغیرہ کے تمام راز اور نکات اُس شے میں پنہاں ہیں جو ان تمام امور میں ایک مشترک حقیقت ہی اور جس کے بغیر ایک قوم کا نظام خودداری اور شیرازۂ جمعیت یکسر منتشر و پریشان ہو جانا لازمی ہے کیوں کہ یہ قطعی ہی کہ کسی قومیت کے

قیام اور وقعت کی بنا اور اُس کے تنازع بقا کا انحصار تمامتر مذکورہ خصوصیات کے لحاظ سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون شے ہے جس میں اور جس کی وساطت سے بوقت واحد یہ تمام باتیں بروئے کار آسکتی اور جلوہ دے سکتی ہیں اس کے جواب میں بلا تامل اور بکمال اطمینان و یقین کہا جا سکتا ہے کہ زبان۔ زبان وہ شے ہے جو اپنی ابتدائی منزل میں ایک قوم کو نطق اور قوت تکلم سے سرفراز کرتی ہے اور اپنے وسطی منزل میں اُس کے دل و دماغ کا لباس قرار پاتی ہے۔ اور آخر کار اُس کی حیات و اقبال کا واحد ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں سے کونسی زبان ایسی ہے جو مذکورہ خصوصیات کے معیار پر ٹھیک بیٹھتی ہے درانحالیکہ یہی خصوصیات ہیں جن کو فطرت نے قانون بقائے اصلح کی رو سے قومی حیات کے لئے لازمی کردیا ہے اور ان کے فقدان سے قوم کا اپنے مرکز ثقل سے گرجانا یقینی ہے۔ کمزوری اور نقص بمقابلہ قوت اور کمال کے ہمیشہ فنا ہوتے رہیں گے۔

ہم کو اس سوال کا جواب دینا ہے کہ ہندوستان میں کون سی زبان ایسی ہے جو مذکورہ لوازم حیات کی حامل ہے یا ہوتی رہی ہے درآنحالیکہ ہم نے ترکیبی قاعدہ سے پہلے ہی فرض کرلیا ہے کہ اردو میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔

ہندوستان کے کسی خاص خطہ میں چلے جایئے۔ شمال میں خواہ جنوب میں۔ مشرق میں خواہ مغرب میں بجز چند مخصوص مقامات کے عجب عجب مرکب معجونیں نظر آئیں گی۔ بطور مثال کے مدراس کو لیجئے۔ آبادی کی تہذیب معاشریہ زیادہ تر اُس کے کثیر حصہ آبادی کے عادات و افعال وضع و لباس اور اخلاق وغیرہ کے لحاظ سے اندازہ کیجاتی ہے۔ اور اسی اعتبار سے اُس کی ترقی و تنزل کا خیال کیا جاتا ہے مگر مثال کے لئے جو مقام پیش کیا گیا ہے عجیب و غریب ہے۔

لباس کس قدر مضحکہ خیز ہے، وضع کیسی عمدہ ہے، عام عادات کیسے سنجیدہ و متین ہیں خوراک کیسی پاکیزہ ہے خشک مچھلی، زندہ کچھوے کا گوشت پسندیدہ غذائیں ہیں! انھیں اعتبارات سے تخیلات، انداز گفتگو اور باہمی برتاؤ وغیرہ کی شگفتگیاں اور لطف تبادلہ خیالات وغیرہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جن کے اعتذار میں نہ صرف یہ کہنا

بالکل ناکافی ہی کہ ہر ملکے وہر رسمے، بلکہ یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کے تاریک عہد میں اور اِس قسم کے عہد میں بہت تھوڑا ہی سا فاصلہ ہی۔ تقریباً تمام جنوبی ہند میں ایسی "ہنومانی" تہذیب پائی جاتی ہی اس عیب کا واحد سبب یہی ہی کہ یہاں کی زبان یا زبانیں وہ ہیں جو ادبیت سے بالکل مُعرّا ہیں اور قومیت سے یکسر محروم، وسعت، لطافت، نزاکت، باریکی تخیل، علوم، وغیرہ کسی چیز کا پتہ نہیں۔ ان کی دنیا میں زبان کا کام صرف انسان کی اشد ضروریات کو پُورا کرنا ہی۔ حسن صورت، حسن خیال، حسن بیان یہ تمام چیزیں مہمل اور دُور از کار ہیں پس جس فرقہ کی زبان ان امور سے کوئی لگاؤ نہ رکھے گی اُس کے عجیب الہیئت ہونے میں شاید ہی کسی کو شک ہو اور اُس کا لازمی انجام یہ ہی کہ وہ فرقہ ذاتی قومیت و ترقی سے بالکل بے بہرہ ہی اور حکومت وقت صفاتی حیثیت سے جس طرف موڑ دے اُسی طرف چل نکلتا ہی۔

جہاں جہاں اُردو مادری زبان نہیں ہی یا کثرت سے نہیں بولی جاتی بلکہ اس کے بجائے کوئی اوہنومانی مجہول القومیت، بھونڈی، غیر سنجیدہ غیر ملکی زبان بولی جاتی ہی سب جگہ نظام معاشرت میں بے شمار اعجوبہ باتیں محسوس ہوں گی کہ اک معمولی اور ادنیٰ ذوقِ سلیم رکھنے والا محب وطن بھی اپنے ادبی و اخلاقی ضمیر کی رو سے اکراہ و تکدّر کے بغیر نہ رہ سکے گا۔

بخلاف اس کے اُردو دان خطّے کی قومیت مسلم ہی۔ کسی قسم کا ابہام یا اعجوبگی نہیں ہی معاشرت پاکیزہ ہی۔ تخیل ستھرا ہی، اختیارات لسانی بہت وسیع ہیں اور بحیثیت مجموعی اس قسم کے مقامات کی تہذیب ایسی دل آویز ہے کہ ہر ہر قدم پر ترقی و اقبال کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی اور فی الحقیقت اصلی غایت فطرتِ زبان کی یہی ہی کہ وہ السنہ غیر پر بسبب اپنے پاکیزہ اور تاریخی صفات لسانی کے دخیل و قابض ہوجائے اور ساتھ ہی اس کے داخلی حیثیت سے برابر ترقی کرتی رہی۔ اور زبان کی ترقی بالکل ایک غیر مرئی شے ہی جس کا آسان سا معیار یہی ہی کہ اُس نے اپنے فرقہ کو ایک مستقل قوم بنا دینے میں کس درجہ کامیابی حاصل کی ہی اور اس لحاظ سے اُردو بدرجۂ اتم کامیاب ہی اور یہ صرف اس وجہ سے کہ اُردو اُن زبانوں سے ماخوذ و مرکب ہے جو اپنے اپنے اقبال کے زمانہ میں نہایت ہی عظیم الشان اور مستقل ادب اور تمدّن کی حامل رہ چکی ہیں اور جن کی تاریخ گویا تہذیب لسانی کے مختلف منازل اور ترقیوں کا نہایت مکمل مجموعہ ہی۔

پس بہ لحاظ امور مذکورۂ بالا اگر اُردو کو ہندوستان میں روز بروز قومی رنگ ملتا جا رہا ہی اُس کی وسعت اور ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی ہے تو یہ عین اقتضائے قانون قدرت ہی۔ ہر چند کہ اس کی رفتار بہت سُست ہی مزید براں طرح طرح کی مزاحمتوں سے اُس کو سامنا کرنا پڑا ہے بر ینہم صرف ایک قلیل مدت کے مابین مقابلہ سے صاف معلوم ہو سکتا ہی کہ کل وہ کہاں تھی، آج کہاں ہی اور کل کہاں جا پہونچے گی۔ جتنی کمزوریاں اور نقایص فی الحال اُس میں ہیں اُن کی محض ایک علت ہے وہ یہ کہ اُردو کوئی حربی زبان نہیں ہی وہ ایک "بزمی" زبان ہی اُس کو کبھی جنگی سرپرستی نہیں نصیب ہوئی اس لئے اُس کو اُن کوششوں اور دشمنیوں کا مقابلہ کرنا ہے جو بصورت اُس کے حربی ہونے کے وہم و گماں میں بھی نہ آسکتی تھیں۔ با جبروت شاہان اسلام کے زمانہ کی عربی و فارسی کا رواج جب کہ ہندوستانی عورتوں نے بھی فارسی پڑھنا موجب فخر سمجھا تھا حربی زبان کے فاتح ہونے اور مزاحمتوں کے نہایت ذلت سے ٹھکرا دینے کا کافی ثبوت ہی۔ تاہم چوں کہ اُردو کی عمارت خاص مضبوط علمی زبانوں کی بنیاد پر قایم کی گئی ہی لہذا اُس کی ترقی میں کوئی کلام نہیں ہی اور گو کہ اُس کی مخالف ہنیں نہایت کثرت سے خس و خاشاک کی طرح اس کے سیلاب ترقی میں حائل ہوتی رہتی ہیں مگر اُن کی ناقص تہذیب بہت تیزی سے فنا ہوتی جا رہی ہیں اور بہت قریب ہی وہ زمانہ جب کہ اُردو ہندوستان کے لئے اور ہندوستان اُردو کے لئے ناگزیر سمجھے جائیں گے۔ کیوں کہ جن اصحاب نے اس زبان کی تاریخ کو بغور دیکھا ہی وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قسم کے زبردست سیاسی، ملکی، خارجی، داخلی روڑے اس بیکس و بے بس زبان کی راہ میں اٹکائے گئے مگر زبان کا قانون بھی قدرت کے دیگر قوانین کی طرح اٹل ہی اُردو نے ہر دشمن کو نیچا دکھایا اور اپنی مستقل رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔ اور اب نتیجہ یہ ہی کہ اُردو اخبارات، اُردو رسائل، اُردو مجالس، اُردو اشتہارات، اُردو دفاتر، اُردو مدارس، اُردو تصانیف، اُردو تالیفات، اُردو تراجم، اُردو مشاعرے، اُردو خطبے، اُردو قصص و ناول، اُردو یونیورسٹی وغیرہ وغیرہ نے تمام ہندوستان میں طولاً اور عرضاً نہایت تابانی اور درخشانی کے ساتھ بانگ دہل قدرت کے اس قانون کا اعلان کر دیا ہی کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان قرار پا چکی ہے اور یہ کہ اگر ہندوستان کو ایک قومی اور متحدہ ہندوستانی قومیت پیدا کرنا ہی، اگر ہندوستان کو موجودہ دَورِ مادی میں اپنی جہد

حیات کو باقی و قایم رکھنا ہی اگر ہندوستان کو اپنی آیندہ متقل تہذیب و تمدن کو زندہ کرنا ہی اور اگر ہندوستان کو اپنی آنے والی نسلوں کے لئے اپنے بعد ایک ممتاز تاریخ چھوڑنا ہے تو یہ بغیر اُردو کے قطعاً محال اور ناممکن ہی۔ اور اس پیشین گوئی کے لئے ہم کو کہیں دُور نہیں جانا پڑے گا بلکہ اُردو کی مختصر تاریخ نہایت صفائی سے اس پر شاہد ہی۔

حیرت ہی کہ وہ محدود اور متفرق فرقہ جو غلطی سے قومیت ہند کو اپنا سمجھکر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی فرسودہ و بوسیدہ زبان کو اُردو کے مقابلہ پر ہمیشہ لانے کا عادی رہا کس فراخدلی سے اُردو کی رعنائی و زیبائی کے آگے سرِ تسلیم خم کر چکا ہی اور بسا حیرت ہی کہ وہ قوم جس کی قسمت میں تھا کہ چھ ہزار میل کی مسافت قاہرہ پر بیٹھکر حکومتِ ہند کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھے باوجود اس بُعد و اجنبیت کے اُردو پر اس قدر گرویدہ و فریفتہ ہو کہ حامیان اُردو کی صف میں جگہ پانے کی اہل و مستحق ہو ؎

این سعادت نہ کسبی و عملی ست
از عنایاتِ فیضِ لم یزلی ست

ان تمام حقایق و واقعات بصائر و عبر کے باوجود بھی اگر ہوا سے لڑکر اور زمانہ سے بھڑکر اُردو کی طاقت لسانی سے اغماض و انکار کیا جائے تو یہ سراسر جنون اور خبط ہی ؎

زبیدردی نگفتم سخت پیکانِ ترا ہرگز
بحمد اللہ کہ آئینِ دل آزاری نمیدانم

تبصرے

رسائل عماد الملک روح سیاست خونابۂ عشق وحکایاتِ شرلک ہومز کلماتِ طیبات نیاز ہمایوں آوازۂ حق دماغی تربیت	از اڈیٹر
البیان الکامل فی تحقیق الدق والسل	از ڈاکٹر حاجی حیدر علی خاں صاحب ایف ۔ آر ۔ سی ۔ ایس

رسائلِ عماد الملک

نواب عماد الملک بہادر ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی ۔ (مولوی سید حسین بلگرامی)

ملک میں اپنے تبحرِ علمی اور اعلیٰ ادبی ذوق کی وجہ سے خاص اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۔ وہ جیسے عربی فارسی کے فاضل ہیں ویسے ہی انگریزی زبان کے بھی مستند ادیب ہیں اور اسی مناسبت سے مشرق و مغرب کے پسندیدہ خصائل اور ذوق تہذیب کا عمدہ نمونہ ہیں ۔ گو وہ مختلف عہدوں اور مختلف صحبتوں میں رہے مگر اُن کی تمام عمر تعلیمی معاملات پر غور کرنے اور مطالعہ کتب میں صرف ہوئی اور باوجودیکہ اُن کی عمر اسّی سال کی ہے مگر وہی ذوق اب تک باقی

ہے۔ اُن کی صحبت بہت پُرلطف ہے۔ اکثر شعر و سخن اور علمی ادبی امور پر ذکر کرتے ہیں عربی فارسی اُردو کے ہزارہا منتخب و اعلیٰ درجے کے اشعار یاد ہیں جن سے اُن کے ذوقِ سلیم کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کی صحبت ایک ایسی تعلیم ہے جو آیندہ بہت کم نصیب ہوگی۔ اہل علم اور طلبہ کے بہت قدرداں ہیں۔ ایک پھٹے حال طالب علم سے مل کر وہ جس قدر خوش ہوتے ہیں اس قدر انھیں کسی امیر سے مل کر خوشی نہیں ہوتی۔ ان کا مزاج بہت سادہ اور بے تکلف ہے۔ نمود و نمایش اور تکلّف سے کوسوں دور ہیں۔ صداقت شعاری میں وہ مشہور بلکہ بدنام ہیں۔ اپنی رائے ظاہر کرنے اور سچ بات کہنے میں کبھی نہیں چوکتے خواہ ان کا مخاطب کوئی ہو۔ وضعداری اُن میں ویسی ہی جیسی پُرانے لوگوں میں سننے میں آتی تھی۔ اُن کا ذوق اِن تین چیزوں میں ہے۔ سادگی، صفائی اور حسن۔ اب اس میں مادّی اشیا بھی آگئیں، ادب بھی آگیا۔ اور مذہب بھی۔ مذہب کا آج کل بڑا خیال ہے، اکثر اس کا چرچا کرتے ہیں اور اسلام کو بہترین مذہب مانتے ہیں اور اُس کی خوبیاں بیان کرتے رہتے ہیں۔ وہ ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن سے جوانی تک علم ہی کا مشغلہ رہا۔ علمی جلسوں اور علمی صحبتوں میں بسر ہوئی اور ملازمت بھی کی تو علم کی۔ گویا نسب بھی اُن کا علم ہے اور حسب بھی علم۔ اور اب بھی علم ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

اِن کا یہ علمی ذوق حظِ نفس اور لطفِ تخیّل ہی تک نہیں رہا بلکہ علمی تحریکات میں بھی وقتاً فوقتاً شریک رہے۔ اور بعض کا وجود محض آپ کی تحریک سے عمل میں آیا۔ مثلاً انجمنِ ترقی اُردو کا ابتدائی فروغ محض آپ کی توجہ و عنایت سے ہوا اور اب تک آپ اس کے صدر ہیں اور اس کے علمی اور ادبی معاملات میں برابر مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ اِسی طرح دار المصنفین بھی آپ کا زیر بارِ احسان ہے۔ آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس ان کے علمی مشوروں اور مالی امداد کی ممنون ہے۔ حیدرآباد کے دار العلوم کو محض آپ کی ذات سے رونق اور ترقی ہوئی۔ کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد دکن) آپ ہی کا قایم کیا ہوا ہے جس میں آپ نے عربی، فارسی، اُردو کے نایاب قلمی نسخے بڑی تلاش سے جمع کیے۔ یہ ذخیرہ بہت قابلِ قدر ہے۔ دائرۃ المعارف آپ ہی کی تحریک پر قایم ہوا اور جو کچھ بھی کام ہوا وہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ آپ ہی کی تحریک اور تحریر پر امیر خسرو کے کلام کی ترتیب و تدوین شروع ہوئی۔ حیدرآباد میں ملکی حرفت و صنعت کی ترقی میں ساعی رہے اور اس کے لیے مدارس قایم ہوئے۔ تعلیم نسواں کے آپ بہت بڑے حامی ہیں۔ حیدرآباد میں جو تعلیم نسواں کا چرچا ہے اور غالباً دوسرے مقامات سے یہاں جو

تعلیم نسواں کو زیادہ ترقی ہوئی وہ آپ ہی کے حسن مساعی کا نتیجہ ہے۔ اب بھی تدوین و اشاعت کتب قدیمہ کا سررشتہ آپ ہی کو تفویض ہے۔ نادار اور ہونہار طلبہ کو آپ ہمیشہ اپنی جیب سے وظیفے دیتے رہتے ہیں ۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربہ سے کہتا ہوں کہ کوئی علمی ادبی یا تعلیمی یا کوئی مفید تحریک ہو آپ اُن کے پاس لے جائیے وہ بڑی خوشی سے اِس میں شریک ہونگے اور اپنی بساط سے بڑھ کر مدد دینگے ۔

اِس کے بعد ہمیں اُن کی تحریریں پڑھنی چاہئیں ۔ جو رسائل عماد الملک کے عنوان سے ابھی طبع ہوئی ہیں ۔ اس میں کل ۱۹ مضامین ہیں ۔ اِن میں سے ۹ علمی مباحث پر ہیں ۲ اخلاقی ۳ زرعی ۴ تعلیمی اور ایک سیاسی امور پر ہے۔ ان سب میں قابل غور اور عالمانہ مضمون "دیسی زبانوں میں علمی اصطلحات" پر ہے۔ یہ مضمون پچاس صفحہ پر ہے اور اُردو کے پہلے نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ پچاس سال قبل کا لکھا ہوا ہے لیکن باوجود اس کے خیالات کی جدت و تازگی کی وجہ سے اِس وقت بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہے ۔ اور اس سے نواب صاحب کی علمی قابلیت اور ادبی ذوق کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے ۔ یہ مسئلہ اب بھی اُسی قدر اہم اور قابل بحث ہے جس قدر پچاس سال پہلے تھا ۔ اس زمانہ میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام کے بعد سے یہ مسئلہ زیادہ نمایاں طور سے بحث میں آیا ہے۔ میرے خیال میں نواب صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامع حیثیت سے اس پر بحث کی ہے اور اس کی مشکلات پر نظر ڈالنے کے بعد اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی زبان میں جدید علمی اصطلاحات کے ترجمہ کرنے کے اصول قائم کیے ہیں ۔ یہ موقع اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنے کا نہیں ہے لیکن ہم اتنا ضرور کہنا چاہیئے ہیں کہ جو صاحب اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس مضمون کا پڑھنا لازم ہے۔

تعلیمی مضامین درحقیقت ان کی وہ تقریریں ہیں جو انھوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس یا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں بحیثیت صدر فرمائی تھیں ۔ نواب صاحب اُن بزرگوں میں ہیں جو تعلیم کے معاملہ میں سرسید احمد خاں مرحوم کے ہم نوا اور ہم خیال تھے اور جو مغربی السنہ و علوم کی تعلیم کو قوم کے تمام امراض کا علاج خیال کرتے تھے چنانچہ رام پور میں جو ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا ۔ اُس میں فرماتے ہیں :-

"علوم جدیدہ کی نسبت بھی بعض پرانے فیشن کے لوگ جو کبھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں لاتسلم کا کلمہ زبان پر لائینگے مگر ہم کو اُن سے بحث نہیں ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اکثر وہ حضرات جن کو اس کانفرنس کے

اغراض سے دلچسپی ہی اس امر کو بطور اُصول موضوعہ و علوم متعارفہ مان لینگے کہ اگر ہم مسلمانوں کو اپنی قوم کی اِصلاح اپنی دولت کی ترقی بلکہ اپنے نام و نشان کا بقا مدِنظر ہی اور ہم اپنے آپ کو صفحۂ ہستی سے مثل حرفِ غلط محو کر دینا پسند نہیں کرتے ہیں تو ہم کو ضروری ہے کہ ہم یورپ کی زبانیں سکھیں اور یورپ کے علوم حاصل کریں۔ آج کل بغیر علوم جدید عالم کے کوئی کام دنیا کا پورا نہیں ہو سکتا۔ صنعت، حرفت، تجارت، نوکری، طبابت، وکالت، سپہ گری کسی فن میں بغیر جدید علوم کی مدد کے ہم ترقی نہیں کر سکتے اور یہ علوم ہم کو بغیر انگریزی کی میانجی گری کے سردست حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ہمارا فرض ہی کہ ہم انگریزی زبان کو اچھی طرح حاصل کریں تاکہ مغربی علوم کے خزانہ کی کنجی ہمارے ہاتھ آجائے۔"

لیکن وہ موجودہ تعلیم کے نقائص سے بھی ناواقف نہیں ہیں چنانچہ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"جو لوگ اس طریقۂ تعلیم کے بڑے طرفدار ہیں وہ معترف ہیں کہ یونی ورسٹیوں کی مجوّزہ تعلیم بہت کچھ اصلاح کے لائق ہی اور اس تعلیم سے اخلاق پر اور نفس انسانی کے اعلیٰ جذبات پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عمدہ تعلیم کا جزو اعظم ہی اور نہ خود السنہ و علوم مغربی پر سوائے ایک سطحی اطلاع کے زیادہ عبور حاصل ہو سکتا ہی۔ الا ماشاء اللہ موجودہ تعلیم سے اِس وقت تک نہ کوئی بڑا عالم یا مدبّر یا حکیم مسلمانوں میں پیدا ہوا اور نہ ہونے کی اُمید ہی نہ سر سالار جنگ مرحوم اور نہ سر سید احمد خاں مغفور اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے کیونکہ اُس تعلیم کا دارومدار امتحانوں پر ہی اور امتحانوں کی بھرمار سے بالاضطرار نہ کہ بالاختیار بہت سے منافذ علمی روشنی کے ہمارے لیئے مسدود ہو جایا کرتے ہیں۔ اور ایک بڑا ناقابل برداشت عیب اُس تعلیم میں یہ ہی کہ اپنے مذہبی عقائد و مسائل اور اپنی ملت کی مقدس تاریخ سے ہمارے نوجوان گویا بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں۔ . . . . دوسری تعلیمی اصلاحوں کی بھی کوئی قریب توقع نہیں ہی اور اگر بالفرض اصلاح کی بھی جائے تو کیا معلوم ہی کہ ہماری مرضی کے موافق ہی ہو گی۔ ہم اپنی قومی ضرورتیں خود بہتر جانتے ہیں۔"

اِسی تقریر میں اُنھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے قیام پر بھی بحث کی ہی اور یہ بتایا ہی کہ صرف ایک کالج ترقی کرکے یونی ورسٹی بن سکتا ہی۔ قرطبہ و بغداد کے مشہور مدارس کو بھی ایک زمانہ میں یہی فخر حاصل تھا۔ ڈبلن یونی ورسٹی کی بنیاد بھی صرف ایک کالج پر ہی۔ اِسی طرح علی گڑھ کالج کو یونی ورسٹی بنانے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اس قسم کا کوئی درس گاہ ترقی کرتا ہی تو ایک حد سے گزرنے کے بعد خود بخود یونی ورسٹی کی حیثیت پیدا کر لیتا ہی۔ اور اس قدر ترقی کے اسباب مہیا کرنا بالکل قوم کے ہاتھ میں ہی۔ یعنی مختلف علوم کے درس کا سامان مہیا کرنا، ہر علم کے لیئے ایسے ماہر مدرسین کا مقرر کرنا جن کے نام ہی سے شائقین علم ان کے درس میں شریک ہونے کی آرزو کریں۔ اعلیٰ درجہ کے کتب خانہ اور تجربہ خانہ کا مہیا کرنا وغیرہ۔

اسی ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ :-

"اس تجویز پر یہ نکتہ چینی کی ہی کہ کسی خاص مذہب کی قید کے ساتھ کسی یونی ورسٹی کا قائم ہونا مفید نہ ہوگا۔ یونی ورسٹی کا دائرۂ افادہ وسیع ہونا چاہیئے، کسی ملت و مذہب کی خصوصیت نہ ہونی چاہیئے ورنہ خیالات محدود اور تعصبات غالب ہو جائینگے، جن سے بچنا ترقی علم کے لیئے لازمی اور لابدی ہی۔ میں اس اعتراض کو ایک حد تک تسلیم کرتا ہوں۔ سید صاحب مرحوم نے اسی لیئے علی گڑھ کالج کا دروازہ ہر ملت و مذہب کے لیئے کشادہ رکھا تھا اور اب بھی کشادہ ہی اور کوئی وجہ نہیں کہ آیندہ کشادہ نہ رہے۔ میری ذاتی رائے ہمیشہ سے یہ ہی کہ ہندوستان کے لوگ جو ایک ملک کے رہنے والے ایک بادشاہ کی رعیت ایک قانون کے پابند ہیں، اُن میں اتحاد و اتفاق رہنا چاہیئے اور برادرانہ برتاؤ ہونا چاہیئے۔ گو ملت و مذہب علٰحدہ ہو۔ نظر حقیقت بیں کے آگے ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی سب راہِ حق کے جویاں ہیں فقط عقائد اور طرق مختلف ہیں۔ دیکھئے قرطبہ کی یونی ورسٹی میں نصرانی طالبِ علم کس قدر موجود تھے۔ پس اگر ہماری یونی ورسٹی کا دروازہ بھی ہر ملت و مذہب کے واسطے کشادہ رہے تو میری رائے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ ایک نوع سے خود مسلمان طلبہ کے حق میں مفید ہوگا کیونکہ انصافاً ہمارے ہندو بھائی محنت و مشقت میں اور طالب علمی کی نفس کشی میں ہم سے بہت پیش قدم ہیں اور ہم کو اُن کی صُحبت سے غبطہ کا فائدہ پہنچ سکتا ہی۔"

اس یونی ورسٹی میں اُنھوں نے دینیات کی فیکلٹی قائم کرنے کی بھی رائے دی ہی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

" مختصر ہم یونی ورسٹی سے اپنی دو نہایت مہتم بالشان غرضیں پوری کرایا چاہتے ہیں۔ اوّل تو یہ ہی کہ کوئی مسلمان لڑکا اپنے مذہبی عقائد و مسائل سے ناواقف نہ رہے اور اپنے بزرگانِ دین کی تہذیب و اخلاق سے عاری نہو اور اُس کے ساتھ ہی مغربی علوم پر جامعیت کے ساتھ عبور حاصل کرے اور مغربی خیالات سے پورے طور پر

متمتّع ہو۔ دوسری غرض یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹی ایک ایسا مرکز علوم وفنون بن جائے کہ اس کا اثرِ صالح تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑتا رہے اور اُن کے خیالات کی اُن کے طرزِ معاشرت کی اور سب سے زیادہ اُن کے لٹریچر کی اصلاح کرے۔ آپ بے خبر نہیں ہیں کہ علی گڑھ نے اور تہذیب الاخلاق نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے لٹریچر پر کیا اثر ڈالا تھا۔ میں بلامبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ جتنی اُردو زبان کی کتابیں اس بیس سال کے عرصہ میں تصنیف ہوئی ہیں وہی قابلِ اعتنا نکلیں گی جن پر علی گڑھ کے طریقۂ تحریر کا اثر پڑا ہے ورنہ بہت سی ناولیں اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے اکثر یا تو مادہ سے خالی ہیں یا اُس بیہودہ اور غیر مہذب رنگ میں رنگی ہوئی ہیں جس کی ہماری پبلک بعض خاص خاص سوسائٹیوں کے پلید اور چرک آلود اثر سے عادی ہو رہی تھی۔ عاقل کے لیئے اشارہ کافی ہے۔ اگر فسانۂ عجائب سے لے کر اس وقت کی اُن ناولوں تک جو اپنے مُصنّفین کے نزدیک بہت مہذب طور پر لکھی گئی ہیں غور سے نظر ڈالی جائے اور خاص کر اِس نکتہ کی طرف توجّہ کی جائے کہ اُن میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا گیا ہے تو آپ پر حقیقت کھل جائیگی اور معلوم ہو جائیگا کہ اُن میں یورپ کی بدترین اور ذلیل ترین ناولوں کی تقلید کی گئی ہے اور اُس کا نام تہذیب رکھا گیا ہے۔ باقی باتیں وہی قائم ہیں جو پچھلے وقتوں سے وراثتہً اُن کو ملی ہیں۔ ہم کو پورا یقین ہے کہ اگر یونی ورسٹی قائم ہو گئی تو بہت جلد یہ دھبہ ہمارے موجودہ لٹریچر سے مٹ جائے گا اور قابلِ قدر کتابوں کی تعداد بڑھتی جائیگی اور مُصنّفیں کے تفکّرات وتخیلات میں اصلاح ہو جائیگی "۔

یہ خیالات بیس برس پہلے کے ہیں مگر اب بھی اُن میں تازگی موجود ہے۔ اور ہمارے حالات پر صادق آتی ہے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی قائم ہو گئی ہے، دیکھیں وہ اِن توقعات کو کہاں تک پورا کرتی ہے، اور خاص کر اُردو زبان کی اصلاح و ترقی میں کیا کیا کوششیں عمل میں لاتی ہے۔ یہ توقع ہمیں زیادہ تر عثمانیہ یونیورسٹی سے ہے جس کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ ہم دوسری قومی اور نیم قومی یونی ورسٹیوں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب تک علوم و فنون اپنی زبان میں نہ آئیں گے، ملک میں علم کی عام اِشاعت نہیں ہو سکتی۔ اور اس روشنی میں بھی یہ تاریکی یونہی رہے گی۔

افسوس ہے کہ اس مجموعہ میں نواب صاحب کا عالمانہ مضمون "مُسلم یونی ورسٹی" پر داخل نہیں کیا گیا حالانکہ اسی زمانہ میں اُس کا ترجمہ بھی شائع ہو گیا تھا۔

علمی مضامین میں (علاوہ مضمون اصطلاحات کے) ابن رشد اور اُس کے ہمعصروں پر بہت بڑا مضمون ہی جو (۸۰) صفحوں پر ختم ہوا ہی۔ ایک اور مضمون ہوا پانی پر تقریباً ۵۰ صفحہ پر ہی۔ اس کا تعلق سائنس سے ہی۔ اگرچہ یہ مضمون اس زمانہ میں بہت زیادہ قابل قدر نہ خیال کیا جائے گا لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہی کہ نواب صاحب کو اپنی زبان کی ترقی کا کس قدر خیال تھا کہ انھوں نے پچاس سال قبل اس قسم کے مضمون لکھ کر ملک میں شائع کئے۔ یہ مضمون اب بھی پڑھنے کے قابل ہی۔ ایک مضمون سقراط پر مسجّع اور مقفّٰے عربی میں لکھا ہی جو اس مجموعہ میں شریک ہی۔ تین مضمون زراعت پر ہیں جن کا پڑھنا اُن لوگوں کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہو گا جو اس فنِ شریف سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیا اچھا ہوتا اگر ہر مضمون کے ساتھ اِس کا سنہ تحریر بھی لکھ دیا جاتا۔

نواب صاحب کا سب سے قابلِ قدر کام قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہی جو سولہ پارہ تک ہو چکا ہی۔ افسوس ہے کہ اب اِس کی تکمیل کی توقع نہیں معلوم ہوتی۔ انگریزی میں قرآن پاک کے متعدد ترجمے موجود ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے نواب صاحب کا انگریزی ترجمہ دیکھا ہی اور صاحبِ بصیرت ہیں اُن کا خیال ہی کہ ان ترجموں کو اِس سے کوئی نسبت نہیں۔

اِسی مجموعہ میں ایک خط سر سید احمد مرحوم کے نام نیشنل کانگریس کے متعلق ہی۔ نواب صاحب ہندوستان کی سیاسیات میں سر سید احمد مرحوم سے بالکل متفق تھے۔ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں، زمانہ نے دوسری کروٹ لی ہی۔ معاملات کی نوعیت دگرگوں ہو گئی ہی۔ اب اُس زمانہ کے خیالات کا اس زمانہ میں اعادہ کرنا عبث ہی۔ نواب صاحب اُن بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے انگریزی حکومت کا ابتدائی زمانہ دیکھا تھا اور جو انگریزوں کی قوت ایجادات و اختراعات اور انصاف سے مرعوب ہو گئے تھے اور اُن کو دنیا کی بہترین قوم تصوّر کرتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے کبھی معاشی (اقتصادی) نقطۂ خیال سے اُن کے اُصولِ حکومت پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی تھی۔ یہ چیز بلحاظ تاریخی لحاظ سے یادگار رہیگی۔

روحِ سیاست[1]

ڈراما

(مترجمہ جناب محمد عمر و نور الٰہی صاحب)

ڈراما۔ اصنافِ ادب میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ رکھتا ہے۔ عمدہ ڈراما ادبی کمال، تخیل کی رفعت اور انسانی فطرت کے مطالعہ کی بہترین مثال ہے۔ اور انسانی دل و دماغ اور اخلاق پر اثر ڈالنے کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا علم ادب اعلیٰ درجہ کے ناٹکوں سے خالی اور ملک اس نعمت سے محروم ہے۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ دو قابل اور مستعد نوجوانوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا کے بہترین ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کر کے ملک میں شائع کرینگے۔ جن میں سے ایک جو زیر تبصرہ ہے شائع ہو چکا ہے اور دو ایک طبع کے لیے تیار ہیں۔ اِن صاحبوں کی یہ ادبی کوشش نہایت قابلِ قدر ہے اور ہم انھیں اس پر دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ کو اسی مستعدی سے جاری رکھیں گے اور کسی رکاوٹ یا مزاحمت سے بد دل یا پست ہمت نہونگے۔

روحِ سیاست ۔ ایک انگریزی ڈراما کا ترجمہ ہے جس کی انگلستان میں بے حد قدر و منزلت ہوئی۔ ایک تاریخی اور سیاسی ڈراما ہے۔ جس میں بنی نوع انسان کے محسن اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شریف پریزیڈنٹ ابراہام لنکن کی حیاتِ ابدی کی صحیح جھلک نظر آتی ہے۔ یہ وہ نازک وقت تھا جب کہ جنوب اور شمال میں مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی اور اتحاد کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بنائے مخاصمت غلامی تھی۔ اہل جنوب غلامی سی عزیز شے کو جس پر اُن کی دھن دولت اور تمول کا انحصار تھا، چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور اِس لیے شمال سے آزاد رہ کر اس سے تمتع حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس باہمی جنگ و مخالفت نے تمام امریکہ میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس نازک اور انقلاب خیز وقت میں ابراہام پریزیڈنٹ انتخاب کیا گیا۔ اور باوجود اختلاف رائے، مزاحمتوں اور سازشوں کے اِس نے وہ کام کیا جس پر انسان و ملائکہ ہمیشہ رحمت بھیجتے رہینگے۔ وہ بے حد مستقل مزاج، اصول کا پکا، سیدھا سادا اور صاف سچا

---

[1] یہ کتاب جناب محمد عمر صاحب مترجم ہائی کورٹ جموں (کشمیر) سے مل سکتی ہے۔ قیمت نامعلوم تقطیع چھوٹی۔ ص ۱۴۵

آدمی تھا۔ وہ امریکہ کے اتحاد کے قیام اور غلامی کے مٹانے پر مُصر تھا۔ اگرچہ بہت سے مصائب و آلام نازل ہوئے کُشت و خون ہوا، قتل و غارت گری کرنی پڑی (جس سے وہ سخت متنفّر تھا مگر مجبور تھا) مگر وہ آخر کامیاب ہُوا۔ اِس نے امریکہ میں اتحاد قائم رکھا اور غلامی کو دنیا سے مٹا کر چھوڑا۔ جب وہ فتح پاتا ہے اور اُسے اپنے پاک عزم میں کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ ایک مشہور تھیٹر میں جاتا ہے خلقت کا ہجوم ہے اور سب کی نظریں اسی نیک نفس انسان پر ہیں۔ اور ہر طرف سے اصرار ہے آوازیں بلند ہیں کہ پریزیڈنٹ تقریر کرے کہ دفعتہً اُس بھرے تھیٹر میں ایک بد بخت نادان نوجوان کے ہاتھ سے قتل ہوتا ہے۔ سارے تھیٹر میں کہرام مچ جاتا ہے اور وہ شرافت و نیکی کا پتلا وہیں جان دے دیتا ہے۔ مگر وہ زندۂ جاوید ہے، وہ محبِّ وطن ہی نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کا محسن ہے۔

اِس قسم کے ڈراموں کی ہمارے ملک کو شدید ضرورت ہے۔ پند و موعظت اور لکچر، مجلسوں کی رُوداد یا اور پمفلٹ وہ کام نہیں کر سکتے جو ایک ڈراما کر دکھاتا ہے بشرطے کہ اس کا لکھنے والا صاحبِ نظر اور ادیب ہو اور اِس فن کو سمجھتا ہو۔

قابل مترجمین نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:۔

"گو یہ کتاب مُطالعہ کے لیئے بھی خوب ہے مگر دراصل اس کا اسٹیج پر لانا مقصود ہے۔ اِس کا حُسن و قبح اسٹیج ہی پر معلوم ہو گا۔"

یہ صحیح ہے، لیکن اعلیٰ درجے کے ڈرامے مُطالعہ میں بھی بہت مؤثر ہوتے ہیں۔ رُوحِ سیاست کا شمار اُن ڈراموں میں نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک سیدھا سادا ڈراما ہے جس میں نہ کوئی بڑی پلاٹ ہے اور نہ اشخاص ڈراما کی شخصیتوں کے اُبھارنے اور ممتاز طور پر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ ابراہام لنکن کی شخصیت تو ایسی ہے جس کا اثر خود بخود انسان پر پڑتا ہے مگر باقی اشخاص کم و بیش معمولی نظر آتے ہیں اور اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں جو دل یا حافظہ پر اپنا نقش قائم کر سکے۔ حالانکہ کئی جگہ اس کا موقع تھا۔ مثلاً غلامی کے حامیوں کی جانب سے کوئی شخص ایسا پیش نہیں کیا گیا جو اپنے گروہ کے خیالات و جذبات کا صحیح اظہار کرتا یا مثلاً ڈگلس حبشی کی ملاقات (لنکن سے) زیادہ مؤثر ہو سکتی تھی جس میں انسانی فطرت کے کرشمے زیادہ خوبی کے ساتھ نظر آ سکتے تھے۔ بہرحال اُردو کے لیئے یہ ڈراما بھی بہت غنیمت ہے اور اگر ہمارے ہاں کا کوئی تھیٹر اس کے مناسب حال انتظام کر کے اسٹیج پر لائے اور ان ایکٹو

کو مدنظر رکھے جو مترجمین نے اپنے دیباچے میں لکھی ہیں تو اُمید ہو کہ ہمارے ناٹکوں میں بہت کچھ اصلاح ہو جائے اور دیکھنے والوں کے مذاق پر بھی اثر پڑے۔ مترجمین اپنے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"یہ کتاب دو جداگانہ ڈراموں پر مشتمل ہو جن کی پلاٹ کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں مگر یہ ہر دو ڈرامے ایک ہی وقت میں اسٹیج پر آئینگے اور اُن کے سین یکے بعد دیگرے یا جس طرح اسٹیج کی سہولت اجازت دے، دکھائے جائیں گے"۔

یہ دوسرا ڈراما جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو، **جانِ ظرافت** ہو، جو فرانس کے مشہور ڈراما نویس **مولیر** کی تصنیف ہو۔ غالبًا اسے ساتھ اس لیے رکھا گیا ہو کہ تماشائیوں کی دلچسپی قائم رہے۔ افسوس ہو کہ وہ ہمارے پاس نہیں آیا لہٰذا ہم اُس کے ترجمے کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے۔

مترجمین نے اِس ترجمہ میں اکثر مقفّےٰ عبارت لکھی ہو۔ اُن کے خیال میں اِس کا استعمال بمجبوری اِس لیے جائز رکھا گیا ہو کہ ہماری زبان میں بلینک ورس (نظم غیر مقفّےٰ) کا رواج نہیں۔ اور یہ مجبوری اس لیے واقع ہوئی کہ ایکٹروں کو ربط عبارت کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہو جو ناٹکوں کے تفصیلی حالات سے واقف ہو۔ ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے لیکن یہ ضرور ہو کہ مقفّےٰ گفتگو عام بول چال کے خلاف ہو۔ حالانکہ ڈراما اصل کی سچی نقل ہوتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہو کہ بعض اوقات گفتگو یا عبارت کے جملے بھدّے بھونڈے اور مہمل ہو گئے ہیں یا اصل خیال صحیح طور سے ادا نہیں ہوا اور اس کی قوت کم ہو گئی ہو مثلاً

" اور مجھ پر ذمہ داری کا یہ بار ڈالا جس سے واشنگٹن کو بھی نہ پڑا پالا"

سیورڈ "بندہ معافی کا خواستگار ہو"

لنکن - "یہی جوہر انسانیت کا سنگار ہو"

"قانون کیا ہو؟ محض مختلف رایوں کا مجموعہ، آپ جانتے ہیں اور اہلِ جنوب تو اسے بخوبی مانتے ہیں"

لنکن " سکاٹ کہتا ہو کہ بیس ہزار سے ایک بھی کم سپاہی درکار نہیں"

سیورڈ - "اور یہاں دس ہزار بھی تیار نہیں"

"کونسل کے ایک ہی ممبر پر اُن کی حکمت عملی کا مدار ہو اور یہ کھلا ہوا راز ہو کہ وہ ممبر سیورڈ نامدار ہو"

"یہ میرے صادق دوستوں کی رفاقت کا جام ہے جن کی محبت کا   یہ دشمن بردہ فروشی درم ناخریدہ غلام ہے۔"

بعض مقامات پر زبان کی خامیاں بھی رہ گئی ہیں اور یہ ڈرامے کے لیئے بہت نازیبا ہے۔ کیونکہ سننے والوں کے کانوں کو یہ ناگوار گزرتی ہیں اور ان سے ڈرامے کا اثر کم ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

کئی جگہ مسز لنکن کو "جنابہ" سے خطاب کیا گیا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

ایک لیڈی مسز لنکن سے ملنے آئی ہے اور ملنے کے کمرے میں بیٹھی ہے۔ خادمہ آکر اطلاع دیتی کہ :۔

"ایک لیڈی صاحبہ مدّت سے منتظر ہیں" (مطلب یہ ہے کہ بہت دیر سے منتظر ہیں)

"یہ تو جنگ ہے، میں نے اسے خون کا مقدمہ نہیں بنایا"

"اُس نے فردِ حساب تیار کرلیا ہے"   (فرد مؤنث ہے)

"جب باغی فوج میرے لینڈ سے نکل جائے"

یہ بہت مکروہ لفظ ہے۔ اور جب ہماری زبان میں اِس کے لیئے متعدد لفظ موجود ہیں تو کیوں یہ انگریزی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

"اُنھیں سلام دو" - یہ اینگلو انڈین محاورہ ہے، فصیح اُردو نہیں ہے۔

"حضرات! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ تشریف رکھیئے" یہ انگریزی جملہ کا لفظی ترجمہ ہے۔ اُردو میں اِس طرح نہیں کہتے۔

ڈراما ادبی نقائص سے بری ہونا چاہیئے۔ ہم نیک نیتی سے مترجمین کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اِس معاملہ میں بہت احتیاط کریں اور بہتر یہ ہوگا کہ وہ اپنے ترجمے کسی قابل ادیب کو دکھا لیا کریں۔

بہرحال ہم اِن دونوں صاحبوں کے بہت ممنون ہیں اور ان کی کوششوں کو بہت وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے اُردو زبان کی بہت بڑی کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور آیندہ وہ دُنیا کے بڑے بڑے اساتذہ اور اعلیٰ درجہ کے ڈراما نویسوں کی تصانیف کا ترجمہ کرنے والے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ ہر ملک کو اپنے حالات سے اپنے ڈراما خود لکھنے چاہئیں مگر ہمارے ملک کی حالت اس وقت ایسی ہے کہ اُسے اعلیٰ تصانیف کے ترجمہ

کی شدید ضرورت ہی تاکہ اہلِ ملک کے سامنے بہترین نمونے موجود ہوں۔ اُن میں ذوقِ سلیم پیدا ہو اور عمدہ تصانیف کی ترغیب و تحریک ہو۔ ایک مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی تصنیف سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف کا ترجمہ بدرجہا بہتر ہی۔ جن اساتذہ کے نام اُنھوں نے ہمیں لکھ کر بھیجے ہیں اُن کی تصانیف تمام عالم میں مسلّم اور مقبول ہیں اور اُن کے ترجمہ سے بلا شبہ ہماری زبان میں بیش بہا اضافہ ہوگا اور اُردو داں طبقہ کو بہت بڑا فائدہ پہنچیگا۔ لیکن آخر میں ہم اتنی التجا کرتے ہیں کہ یہ ترجمے ادبی لحاظ سے بھی بے عیب ہونے چاہئیں۔

۱۔ خونِ نابۂ عشق[1]

۲۔ حکایاتِ شرلک ہومز[2]

مُترجمۂ

(پروفیسر فیروز الدین مراد صاحب ایم ایس سی۔ پروفیسر علم الطبیعیات دارالعلوم علی گڑھ)

جب یہ دو کتابیں ہمارے پاس پہنچیں تو قابل مترجم کا نام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ پروفیسر مراد صاحب اب تک علمی مضامین لکھتے رہے ہیں اور زیادہ تر شوق انھیں سائنس سے رہا ہی۔ چونکہ اس میدان کے مرد بہت کم ہیں اور ہمیں ایسے حضرات کی ضرورت ہی جو اُردو زبان میں علمی اور خاص کر سائنس کے مضامین شائع کرکے اہلِ ملک کی معلومات میں اضافہ کریں اس لئے ہماری حیرت کچھ بے جا نہ تھی کہ فاضل پروفیسر سائنس پر لکھتے لکھتے ناولوں کے ترجموں پر اُتر آئے۔ یہ زیادہ مناسب ہوتا اگر وہ اپنے کسی شاگرد یا دوسرے لوگوں کو، جن کی تعداد ہمارے ملک میں کچھ کم نہیں ہی، اس کام پر مامور کردیتے لیکن خوشی کی بات یہ ہی کہ اُنھوں نے مبتذل ناولوں کے ترجموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ ایسے ناول یا حکایات کا ترجمہ کیا ہی جس میں علمی جھلک پائی جاتی ہی۔ کانن ڈائل

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور۔ ۱۹۵۔ ریلوے روڈ۔ قیمت عصہ، ۲ ملنے کا پتہ:۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علیگڈھ

کا نام دُنیا میں ضرب المثل ہو گیا ہی اور اِن کی کتابوں کا ترجمہ اکثر زبانوں میں ہو چکا ہی۔ اُن کی کتابیں اور کارنامے منطقی استدلال کا عجیب و غریب سلسلہ ہیں۔ اور سُراغ رسانی کو حدِ کمال تک پہونچا دیا ہی۔ اِن کی نظر، قوتِ تمیز اور انتقالِ ذہن حیرت انگیز ہی۔ اگرچہ قصے فرضی ہیں لیکن اصل سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ اور پڑھنے والے پر کم سے کم اتنا ضرور اثر پڑتا ہی کہ ہمیں اپنی آنکھوں اور دماغ سے کیونکر کام لینا چاہیئے۔ اور یہ بڑی چیز ہی۔ اردو زبان میں ایسی بہت کم کتابیں ہیں جسے لڑکے لڑکیاں مرد عورت سب پڑھ سکیں، جو انتہا درجہ کی دلچسپ بھی ہوں اور مفید بھی۔ اس خیال سے ہمیں قابل پروفیسر صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اُنھوں نے اس طرف توجہ فرمائی لیکن ساتھ ہی ہم یہ اُمید بھی کرتے ہیں کہ وہ علمی شوق کو ترک کرکے ہمہ تن اس میں مصروف نہو جائینگے۔

ترجمہ صاف اور ستھرا ہی۔ البتہ اس کے متعلق دو باتوں کی شکایت ہی ایک تو یہ کہ کہیں کہیں مشکل اور علمی اصطلاحات کا استعمال کیا ہی حالانکہ وہی مطلب زیادہ آسان الفاظ میں ادا ہو سکتا تھا۔ دوسرے بعض بعض جگہ زبان اور محاورے کی خامیاں پائی جاتی ہیں جو دوسری طبع میں رفع کردینی چاہئیں۔

کلماتِ طیّبات[۱]

(مرتبہ جناب شرف الدین احمد خاں صاحب)

یہ ایک چھوٹی تقطیع کی مختصر سی کتاب ہی جس میں قابل مرتب نے جناب امیر علیہ السّلام کے اقوال جمع کردیئے ہیں۔ اِن اقوال کی صحت کے متعلق کوئی رائے دینا مشکل ہی۔ کیونکہ بہت سے اقوال اور اشعار ایسے ہیں جو جناب امیرؑ کے نام سے منسوب کردیئے گئے ہیں۔ قابل مرتب دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"۱۸۶۶ء میں پیرس کے مسٹر ویٹیر نے جناب امیر علیہ السّلام کے اقوال منتخب کرکے شائع کیئے تھے جو حُسنِ اتفاق سے مجھے مل گئے۔ اِس خیال سے کہ لوگوں کو اُن اقوال کی صحت میں شبہ نہ ہو میں نے ترجمہ کے بعد بڑی محنت

---

[۱] ملنے کا پتہ:۔ شرف الدین احمد خاں صاحب، ہیڈ کلرک ہوم دیپارٹمنٹ، رام پور، ریاست (یو۔پی)، قیمت عہ

کے ساتھ اصل عربی کے اقوال کی جستجو کی۔ جو خدا کی مہربانی سے ہاتھ آگئے اور میں اُن کو لائق ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

کیا عجب بات ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام کے اقوال کے لیئے بھی ہمیں یورپ جانے کی ضرورت پڑی عربی اقوال کے نیچے اُردو ترجمہ درج ہے اور مقابل صفحہ پر انگریزی ترجمہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقوال تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ اور حکمت و دانش کی جان ہیں۔

نیاز

یہ اُردو کا ایک ماہانہ رسالہ ہے جو لُدھیانہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اِس کے اڈیٹر جناب شیر احمد خاں صاحب اخوندی بی اے ہیں (جس میں اُن کے شریک محمد یحییٰ اشہر ہیں) اُردو زبان کی اشاعت و ترقی کے لیئے جو کوشش بھی کی جائے قابلِ قدر ہے۔ پنجاب اس معاملہ میں پیش پیش ہے اور ہر سال اس کا قدم اُردو کی خدمت میں آگے پڑتا ہے۔ شیر احمد خاں صاحب قابلِ مُبارک باد ہیں۔ اگرچہ اس راہ میں بہت سی مشکلات ہیں مگر اُنھوں نے بڑی محنت اور شوق سے نیاز کو مُرتّب کیا ہے اور ناظرین کی تفریح و معلومات کے اضافہ میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ تاریخی معلومات بھی ہیں۔ نثر میں تخیل کی جولانیوں کے ساتھ شعر و سخن کا ذوق بھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دلچسپ فسانے بھی ہیں۔ لکھنے والوں میں بعض مشاق مضمون نگار اور ادیبوں کے نام نظر آتے ہیں۔ پہلا پرچہ لکھائی اور چھپائی کے اعتبار سے بہت گرا ہوا تھا مگر دوسرے پرچے نے ترقی کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ لائق اڈیٹر کی سرپرستی میں آئندہ وہ صورت و سیرت دونوں میں ترقی کریگا

ہُمایوں

یہ ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جو لاہور سے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین ہمایوں مرحوم کی یادگار

میں شائع ہوا ہے۔ اس کے اڈیٹر مرحوم کے قابل فرزند میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا اور جائنٹ اڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی ہیں۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ ہے۔ تقطیع اردو سے ملتی جلتی ہے۔

شروع میں "بزم ہمایوں" کے تحت میں اڈیٹر صاحب نے چند نوٹ لکھے ہیں جن کا تعلق صرف اس رسالہ سے ہے۔ دوسرا عنوان "جہاں نما" ہے۔ جس کے تحت میں چند عجیب اور دلچسپ خبریں ہیں۔ تیسرا عنوان "علمی شعاعیں" ہے۔ جس میں علمی معلومات درج ہیں۔ آخری دو عنوان دو دو صفحہ کے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۴ سے ۵۴ تک میاں شاہدین صاحب مرحوم کے حالات اور اُن کی شاعری پر ایک مختصر نظم اور دو مضمون ہیں۔ نظم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی ہے۔ باقی دو مضامین سے ایک مضمون مرحوم کے حالات پر اُن کے فرزند میاں بشیر احمد صاحب کا ہے اور اُن کے کلام پر مولانا تاجور کا۔ بقیہ حصّے میں مختلف قسم کے مضامین ہیں۔ آخر سات صفحوں میں نظم ہے۔ جس میں ملک کے بعض نامور شعرا کا کلام بھی ہے۔

رسالہ بہت سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے اور اہلِ ملک کے ذوق کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے اور اُسے دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پنجاب نے اُردو زبان کی قابلِ قدر اور قابلِ شکر خدمت کی ہے اور یہ رسالہ اس کا تازہ ثبوت ہے۔ ہم فاضل اڈیٹروں کی خدمت میں مبارکباد عرض کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ ملک میں اس رسالہ کی قدر کی جائے گی۔

آوازۂ حق[1]

(از جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش، ملیح آبادی)

حضرت جوش کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اِن کی بعض کتابوں پر اس رسالہ میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ یہ اُن کی جدید نظم ہے۔ جس میں مرثیہ کی طرز پر واقعۂ شہادتِ کربلا کو نظم کیا ہے۔ کل ۹۲ بند ہیں۔ مضمون ہی ہے جو

[1] ملنے کا پتہ:۔ رئیس احمد خاں صاحب رئیس ملیح آباد، لکھنؤ۔ قیمت ۸ر (تعداد صفحات ۴۴)

اکثر مرثیوں میں پایا جاتا ہے، طرز بھی وہی ہے، البتہ اتنی جدّت کی ہے کہ آخر کے تین چار بندوں میں اس حادثۂ پُر الم کو حال کے مصیبت ناک معاملات سے مطابق کیا ہے اور ایک اخلاقی پہلو نکالا ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے حادثۂ کربلا سے جو حق پرستی اور ایثار کی اعلیٰ اور بے نظیر مثال ہے، صحیح طور پر کام نہیں لیا۔ یہ واقعہ کسی خاص گروہ یا خطّہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام عالم کے لیئے سبق آموز ہے۔ یہ واقعہ فسانہ سے زیادہ درد انگیز اور دل گداز ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک ایسا شخص ہونا چاہیئے جس میں انیس کی فصاحت اور شاعری، ایک کامل مؤرخ کی سی وسیع معلومات اور ایک اعلیٰ ڈراما نویس کا سا تخیل ہو اور جو فطرتِ انسانی کے اسرار کا ماہر ہو۔ آیندہ جب کوئی ایسا شخص اس واقعہ کو لکھیگا تو یہ دنیا کی بے نظیر ٹریجڈی ہوگی۔

دماغی تربیت

(مترجمہ جناب محمد ذکی صاحب)

یہ مسٹر جمیس این کی انگریزی کتاب (How to Cultivate Mind) کا اُردو ترجمہ ہے۔ مختصر دیباچہ کے بعد مصنّف کی تمہید ہے جس میں فرنیالوجی (علم کاسہ سر) کی ضرورت اور اہمیت کو ثابت کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ کوئی وہمی اور خیالی علم نہیں ہے بلکہ حقیقی علم ہے اور اس کی بنیاد مشاہدہ اور تجربہ پر ہے۔ اُن کی رائے میں بنیادی کامیابی کے لیئے ضرور ہے کہ کاسہ سر کا معائنہ ماہرِ فن سے کرایا جائے تاکہ انسان میں جو جوہر مخفی ہیں اُن کا علم ہو سکے اور اُن سے فائدہ اُٹھایا جائے اور جو نقائص ہوں اُن کی اصلاح ہو سکے۔ خصوصاً بچوں کی تعلیم کی بنیاد اِسی پر ہونی چاہیئے اور اُن کو اُسی قسم کی تعلیم دینی چاہیئے جس کے لیئے وہ فطرتاً موزوں ہیں۔ اس کے بعد تندرستی پیشے، قاعدے، مطالعہ، سوچنے، انشا پردازی، تقریر و گفتگو، ذہن پر چھوٹے چھوٹے مضمون ہیں۔ جن میں بعض کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ زبان کی غلطیاں جابجا پائی جاتی ہیں۔ اس میں کچھ کاتب اور مطبع کی عنایت بھی شامل حال ہے۔ کتاب چھوٹی تقطیع کی ہے۔ تعداد صفحات (۶۳)۔ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ۔

قیمت ۵ر ملنے کا پتہ:۔ محمد ذکی صاحب۔ اوندرا۔ ڈاک خانہ بی بی پور۔ ضلع اعظم گڈھ

البیان الکامل فی تحقیق الدق والسل

کتاب البیان الکامل فی تحقیق الدق والسل میرے پیش نظر ہی اور مجھ سے اس پر تنقید کی خواہش کی گئی ہی۔
میں اجمالاً اپنے خیالات ظاہر کیئے دیتا ہوں۔ کتاب عمدہ کاغذ اور خط نفیس ہی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اسکو
نہایت شرح وبسط سے مُرتب کیا گیا ہی حتیٰ کہ بہت سارے غیر متعلقہ اُمور مثلاً فلسفہ مذہب پر بھی بحث کی گئی ہی
معلوم نہیں کہ کس مناسبت سے اس کی ضرورت ہوئی۔ اِس کے برعکس بہت سے ضروری اُمور متروک ہیں
جن کی بلحاظِ فن سخت ضرورت تھی۔ مثلاً توضیحی تصاویر۔ ٹمپریچر چارٹ وغیرہ۔

ایک اور چیز جو نظر انداز ہوئی ہی وہ تفصیل ان کتابوں کی ہی جس سے اِس کتاب کی تالیف عمل میں آئی۔
انگریزی الفاظ کا املا صحیح نہ ہونے کے علاوہ بعض الفاظ کا تلفظ جو اُردو میں ادا ہوا ہی وہ بھی غیر
صحیح ہی مثلاً الیومن نہیں بلکہ البیومن ہونا چاہیئے۔ اِسی طرح بوٹے سیم نہیں بلکہ پٹاسیم یا بطاس (عربی)۔
جراثیم دق کے ترتیب کا بیان تفصیل طلب ہی بہتر ہوتا کہ مزید توضیح سے کام لیا جاتا اور تشبیہ کام میں لائی جاتی۔
اِسی طرح بیان تشخیص بھی مزید تفصیل طلب ہی۔ ایسے فقرات کہ "گدھے اپنے آپ کو لائق خیال کرتے ہیں" ایک مؤلف
کے قلم سے نہ نکلتے تو بہتر تھا کہ یہ خلافِ تہذیب فن ہیں اور کتاب کی شان کو نظروں سے گرادیتے ہیں۔

بیان معالجہ میں آرٹیفیشل نیوموتھوراکس کا بیان یعنی کاربن ڈائیوکسائڈ (CO_2) اور نائٹروجن (N)
اور آکسیجن (O_2) کے ذریعہ سے معقول نہیں کیا گیا ہی۔ علاوہ بریں پلیورل افیوژن (Pelural Effusion)
کا علاج جو درج کیا گیا ہی وہ آج کل کے خیالات کے خلاف ہی۔

حاجی حیدر علی

ایف آر، سی، ایس، آئی

ڈسٹرکٹ سول سرجن اورنگ آباد

مورخہ ۲۲ رجنوری ۱۹۲۲ء

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبانِ ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔ حجم کم سے کم ۱۵۰، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

۳۔ قیمت نو روپئے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک و ارکان انجمن ترقی اُردو سے آٹھ روپئے بارہ آنے۔

۴۔ تمام خط و کتابت بنام آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہیئے۔

(باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)